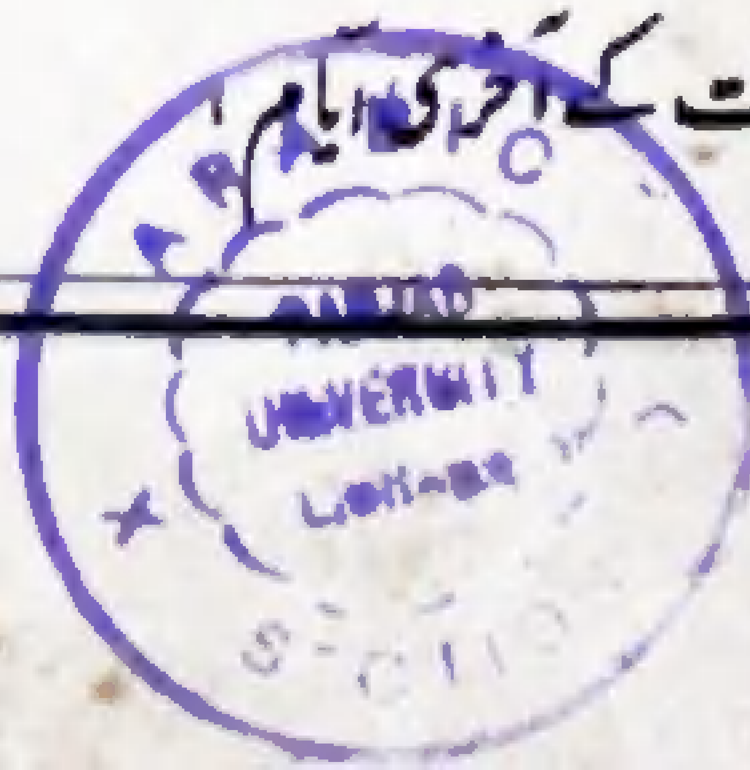
فہرست مضامین





ہدیۂ نیاز بنام

ڈاکٹر سر ضیاء الدّین احمد کے۔ٹی، سی آئی ای، ایم ایل اے،
ایم اے (کینٹب)، پی ایچ۔ڈی، ڈی۔ایس سی

"مؤلّف"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بدایوں کی خاک اس زمانہ میں بھی جب ملک میں پرانی تعلیم کا رواج تھا بہت سے نامورں کو پیدا کر چکی ہے، اور آج بھی جب نئی تعلیم کا زمانہ ہے علم و دانش کے بہت سے خدمتگذاروں کو ہمارے سامنے لا رہی ہے، زیرِ نظر کتاب کے مؤلف کو بھی اسی خاکِ پاک سے نسبت ہے، اور اس لئے اُن کے ناظرین کی یہ اُمید بیجا نہ ہوگی کہ وہ اس کتاب کو اپنی امید کے مطابق پائیں،

بغداد کی خلافتِ عباسیہ جب کمزور ہو چلی تھی اس وقت سے لیکر تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہ اور بغداد کی تباہی تک خلافتِ بغداد اور اس کے ماتحت دگو برائے نام، سلطنتوں کے درمیان صلح و جنگ کے جو تعلقات رہے اور ان سے جو نتیجے پیدا ہوتے رہے، ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے ان کو اپنی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے موضوع بنایا، اور اس پر ایک محققانہ اور دلچسپ مقالہ لکھکر پیش کیا، یہی مقالہ ہے جو

اس وقت کسی قدر ترمیم و اضافہ کے بعد ترجمہ ہو کر ناظرین کے سامنے ان اوراق میں پیش ہے
مسلمانوں میں خلافت کا جو بلند نصب العین تھا اور جس کے معنی یہ تھے کہ کل دنیائے
اسلام ایک علم کے سایہ کے نیچے ہو، وہ پوری طرح اموی دور کے بعد گو عباسیوں کے
زمانہ میں قائم نہین رہا تھا، کیونکہ اندلس کا ملک عبدالرحمٰن اموی کی ہمتِ مردانہ کے
بدولت مستقل وجود حاصل کرچکا تھا، جس کو بغداد کے مرکز سے کوئی تعلق نہ تھا، پھر بھی معتصم
عباسی کے عہد تک جب بغداد کی خلافت کا پنجہ مضبوط تھا تمام امراء اور والیانِ ملک جو
اپنی اپنی جگہ پر کافی طاقتور تھے، خلیفہ کو اپنے سے زیادہ طاقتور پاکر انکی اطاعت پر مجبور تھے
معتصم کے بعد پراگندگی شروع ہوگئی، اور دور دست علاقے خود مختاری کا خواب
دیکھنے لگے، ان میں سے سب سے پہلی خود مختار ریاست تو وہی ہے جس کو خود خلیفہ مامون
نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا، یعنی طاہریہ، طاہریوں سے باغی ہو کر صفاریہ پیدا ہوئے
صفاریوں کی حکومت گو چشم زدن میں ختم ہوگئی، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی تاریخ ابھی
تک لکھی ہی نہین گئی ہے، جستہ جستہ فقرے ہین جو تاریخ کی کتابون مین بکھرے ہین، ان ہی
کو جوڑ کر ان کی تاریخ کا کالبد تیار کیا جاتا ہے، ان کو غلطی سے عجمی سمجھا جاتا ہے اور اسلام
مین "عجمیت" کی نشأۃ ثانیہ ان سے منسوب کیجاتی ہے، لیکن میرا خیال ہو کہ صفاری خالص
عرب تھے اور خارجی اصول پر اٹھے تھے، اور اسی لئے وہ خلافتِ عباسیہ کا دباؤ نہین
مانتے تھے بہر حال میں نے ایک اشارہ کیا ہے، اب تاریخ کا کوئی آیندہ طالب العلم اس کو
اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر دیکھے کہ یہ بات کہان تک لگتی ہوئی ہے،

طاہریون اور صفاریون کے بعد ان کی جگہ سامانیوں نے لی، سامانی خواہ نسل کے عجمی اور ایرانی ہون، مگر مذہب کے پکے سنّی تھے، ان کے بدولت فارسی زبان زندہ اور اسلامی علوم سے مالا مال ہونی شروع ہوئی، چنانچہ فارسی مین طبری کی اسلامی تاریخ ان ہی کے زمانہ مین ترجمہ ہوئی، ان کی تفسیر کا ترجمہ ہوا، قرآن پاک کا ترجمہ ہوا، اور تفسیر تاج التراجم بلسان الاعاجم لکھی گئی، دوسری طرف قدیم ایرانی تاریخ کا وہ ہیولی تیار ہوا جس نے آگے چل کر فردوسی کے شاہنامہ کا قالب اختیار کیا، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی قومیت اور اپنی اسلامیت کے درمیان مضبوط رشتہ قائم کر رہے تھے، اور شاید یہی ان کا اصول سلطنت تھا،

سامانیون کے بالمقابل عراق عرب وعجم میں آل بُوَیْہ پیدا ہوے، جو دیلمیون کے نام سے بھی موسوم ہین اور کبھی عربی جمع کی صورت میں دیالمہ بھی کہلاتے ہین، یہ نسلاً عجمی، مذہباً شیعی، مگر اس کے باوجود سیاسی طور سے خلافتِ عباسیہ کے ماتحت تھے، اسلام مین باطنیہ وغیرہ بعض آزاد فرقے ان ہی کے دامن دولت مین پلے اور جوان ہوے، دوسری طرف مامون کے بعد مسلمانون میں فلسفہ وحکمت کی ترقی ان ہی کے عہدِ سلطنت میں ہوئی،

سامانیوں کے زیر اثر غزنوی پیدا ہوے، اور آخر ایک طرف غزنویوں کے زور و قوت اور دوسری طرف دیلمیوں کے دباؤ سے سامانی مٹ گئے، غزنویہ نے وہ زور پایا کہ دیلمی بھی ان کے آگے جھک گئے، غزنویہ کے اسی زور کے زمانہ میں نیشاپور کے مطلع سے سلجوقی

ترکوں کا آفتاب طلوع ہوا انھوں نے دیلمیوں کا خاتمہ کردیا، غزنویوں کو گھیر لیا، اور تیسری طرف چینی ترکستان کے خانوں کو جو آل افراسیاب کہلاتے تھے، پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا،

چند روز کے بعد سلجوقیوں کے ٹکڑے ہوگئے، اور ان ہی میں سے خوارزم کے بادشاہ خوارزم شاہ پیدا ہوے، جو سلجوقیوں کے آزاد کردہ غلام تھے، یہ چھٹی صدی ہجری کا زمانہ تھا انھین خوارزم شاہیون کے اور بغداد کی رہی سہی خلافت کے درمیان کشاکش پیدا ہوئی اور دونون نے وسط ایشیا کی ایک تازہ دم قوم تاتاریوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھارا اور نتیجہ مین دونوں کی تباہی ہوئی، اور ان دونون کی تباہی سے ہندوستان اور شام کے درمیان کی ساری دنیاے اسلام غرقِ خون ہوکر خاک کا ڈھیر بن گئی،

ہمارے لائق مصنف نے ان ہی واقعات کو جو خلافت اور سلطنت کے سیاسی اور مذہبی تعلقات و روابط کے نتیجے تھے، بڑی تلاش اور دلچسپی سے مرتب کیا ہے، گو کتاب بڑی نہین مگر اس کی قدر و قیمت بڑی ہے، اور یہ کہنا چاہئے کہ اسلام کی ایشیائی سلطنتون کی پوری تاریخ اس مین سما گئی ہے،

اصل کتاب انگریزی زبان مین لکھی گئی تھی، بدایوں ہی کے ایک لائق مترجم جناب سبطین احمد صاحب نے اس کا ایسا سلیس ترجمہ کیا ہے کہ ترجمہ ترجمہ نہین بلکہ اصل تصنیف معلوم ہوتا ہے،

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین اعظم گڈہ

۹ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ
۱۹۳۹ء

کتاب کا خلاصہ

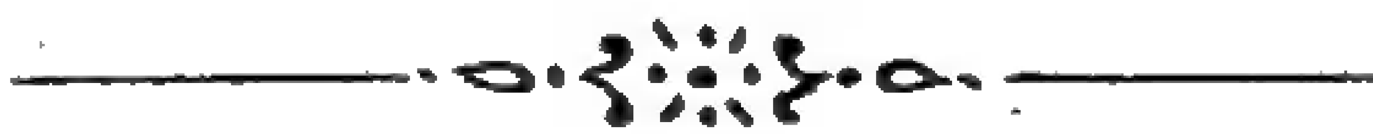
اس مقالہ کا آغاز تیسری صدی ہجری (مطابق نویں صدی عیسوی) کے وسط میں بغداد کے سیاسی حالات کے مختصر تبصرہ سے ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ خلافت کا نظریہ اس زمانہ کے عمل کے کس قدر مطابق تھا، صفاریون نے پایہ تخت خلافت سے مراعات حاصل کرکے علم بغاوت بلند کیا، اوران کی بغاوت سے مذہبی اور دنیوی حکومتون مین علٰحدگی ہوتی گئی، صفاریون کے بعد سامانیون کا عروج ہوا، انھون نے بعض سیاسی اسباب کی بناپر آل بویہ کے مقرر کئے ہوئے خلفاء کے بجاے معزول شدہ خلفاء کی حکومت کو تسلیم کیا، سامانیون کی جگہ جب محمود غزنوی کا اقتدار قائم ہوا، تو سلطنت کی تشکیل میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوا، اس سلسلہ میں حاکم اعلٰی کی نوعیت اور قانونی پابندیوں پر بحث کی گئی ہے۔ آگے چل کر یہ دکھایا گیا ہے کہ خلیفہ کے حکم سے سلجوقیون نے دنیوی حکومت حاصل کرکے ایک عام سنی سلطنت کی بنیاد کس طرح ڈالی، اور بغداد کی دوعملی حکومت سے کیا کیا مشکلات پیدا ہوتی گئیں، اسی زمانہ مین نظام الملک اور امام غزالی کی تصانیف کے ذریعہ سے ایک نیا سیاسی نظریہ پھیلا، جانشینی کی جنگ کے سلسلہ مین خلفاء بغداد اور اس کے اطراف مین اپنی سیاسی آزادی کے دعویدار ہوے، لیکن اس سے خلافت اور سلطنت کے درمیان

مستقل اختلاف پیدا ہوگیا، چنانچہ سلجوقیوں کو سیاسی ترکہ میں دعویٰ اور جواب دعویٰ کا جھگڑا ملا،

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ خوارزم شاہی خاندان کے زمانہ میں سلطنت نے نہ صرف ایک مکمل خود ساختہ ادارہ کی حیثیت اختیار کر لی، بلکہ خلافت سے آزاد ہو کر اس پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن جب منگول کی یورش نے خوارزم شاہی قوت کا قلع قمع کر دیا تو سلطنت اور خلافت کا جھگڑا گو عارضی طور پر ختم ہوگیا، اور بظاہر خلافت غالب رہی، لیکن اس کا یہ غلبہ محض دھوکا تھا، جو ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں خلافت کے خاتمہ سے خود بخود جاتا رہا،

مؤلف

امیر حسن



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا باب

خلافت عباسیہ کا نقشہ تیسری صدی مین

اس امر کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے کہ آل بویہ کی حکومت قائم ہونے تک خلافت اور ایرانی ریاستون کے مابین کیا تعلقات رہے، ضروری ہے کہ بغداد کی اس سیاسی حالت کا خاکہ پیش کر دیا جائے، جس نے خلافت کے منصب کو اپنے بلند مقام سے نیچے اتار کر محض رسمی ادارہ بنا دیا تھا،

جو عہد ہمارے زیر نظر ہے اس کی ابتدا متوکل کے دور (۲۳۲ھ لغایت ۲۴۷ھ ۸۴۷ء لغایت ۸۶۱ء) سے ہوتی ہے، اس دور مین دو خصوصیات نمایان نظر آتی ہین،

۱- معتزلہ عقائد کے خلاف ایک ردِ عمل شروع ہوتا ہے، اور حدودِ سیاسیات تک اس کے اثرات پہنچتے ہین،

۲- ترکون کا اقتدار بڑھتا ہے اور اس کے باعث خلیفہ کی قوت ضعیف ہو جاتی ہے

خلیفہ متوکل پکا سنی تھا، اس کے دور میں شرعی سختی کی طرف جو بازگشت ہوئی وہ[۱] اُن معتزلہ عقائد کے خلاف ایک ردِ عمل تھا، جنکو مامون سے لے کر واثق تک عباسی خلفاء بزور پھیلاتے رہے، اب نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مامون، معتصم اور واثق کے ہاتھوں خلقِ قرآن کے مسئلہ کے سبب سے ائمہ اہلِ سنت کو تکلیفیں پہنچی تھیں اب متوکل کے ہاتھ سے اہلِ سنت کے مخالف فرقے تشدد کا شکار ہونے لگے، وقت اور حالات بھی اس دار و گیر کے لئے سازگار تھے، ترکی سرداروں کا عروج تھا، اور ان کی تنگ خیالی اسی طرزِ عمل کو پسند کرتی تھی[۲]، عوام کا سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ سخت ہوتا تھا، جن کے عقائد میں آزادی کی طرف میلان نظر آتا تھا[۳]، آخر کار ایذا اور عقوبت کی وہ پالیسی جو خصوصیت کے ساتھ اہلِ تشیع کے خلاف جاری تھی، یہود اور نصاریٰ کے خلاف بھی آزار دہ قوانین کی شکل میں نمودار ہوئی[۴]، متوکل کو شیعی فرقہ سے اس درجہ نفرت ہوگئی تھی کہ ۲۳۶ھ ۸۵۰ء میں اس نے اس مقبرہ اور اس کی تمام ملحقہ عمارتیں شہید کر دینے کا حکم صادر کر دیا[۵]، جو سبطِ رسول حسینؓ بن علیؓ کی طرف منسوب تھا، ایک بار ایک شیعی کو حضرت ابوبکر، عمر، عائشہ اور حفصہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو سب و شتم کرنے پر درّے مار کر ہلاک کر دینے کا حکم ہوا، اس حکم کی تعمیل منظرِ عام پر کی گئی، اور مضروب کی نعش بغیر نماز جنازہ کے دجلہ میں پھینک دی گئی[۶]،

---

[۱] بیوی، اخبار بغداد، صفحہ ۱۰۴، [۲] ابن اثیر، جلد ہشتم صفحہ ۹۰، مشہور مورخ طبری جس نے ۳۱۰ھ م ۹۲۲ء میں وفات پائی رات کے وقت اپنے مکان کے اندر دفن کیا گیا، کیونکہ عوام الناس ہجوم کرکے آگئے، اور دن میں دفن کرنے کی اجازت اس بنا پر نہ دی کہ وہ رافضی ہی نہیں بلکہ مرتد تھا، [۳] طبری، جلد سوم صفحہ ۱۳۸۹، [۴] ایضاً صفحہ ۱۴۰۷، ابن اثیر جلد ہفتم صفحہ ۳۶ [۵] طبری جلد سوم صفحہ ۱۴۲۴،

خلیفہ مامون اور اسکے جانشینون کے عہد مین اہل سنت ایذا اٹھا چکے تھے، اب انھین اقتدار حاصل تھا، اور انتقام لینا چاہتے تھے، انھون نے ایک اصلاحی جماعت قائم کی اور گلی کوچون مین گشت کرنے لگے، گھر گھر پہنچتے لوگون کا مذہب تحقیق کرتے اور جس کے عقائد منحرف پاتے فوراً سزا دیتے، یہ دار و گیر صرف شیعہ حضرات تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ اس کے پنجے سے اور مسلم فرقے بھی جو فروعی اختلاف رکھتے تھے محفوظ نہ رہے[1]، گبن کے بقول ان مصلحین نے "خانگی زندگی کا عیش اور آرام تاراج کر ڈالا تھا، وہ نہ امیر دیکھتے تھے نہ غریب، مکانون مین گھس کر شراب لنڈھا دیتے تھے، چنگ اور رباب توڑ ڈالتے تھے، مغنیون کو مارتے تھے اور ہر خوشرو طفل کے ہم صحبتون کو رسواکن شکوک سے ذلیل کرتے تھے"[2] خلیفہ راضی کے عہد تک (۳۲۴ھ ۹۳۴ء سے ۳۲۹ھ ۹۴۰ء) یہ دار و گیر یونہی جاری رہی آخر راضی نے معاصی سے زیادہ اصلاح کو مذموم سمجھ کر حنبلیون کے خلاف ایک فرمان جاری کیا[3]

اس بے رحم ایذا کوشی نے اہل تشیع کی اس نفرت کو تازہ کر دیا جو ان کے قلوب مین عباسی حکومت کی طرف سے پوشیدہ تھی، قدرتی طور پر اختلافات اور بڑھے، ای۔ جی براؤن کہتا ہے کہ اس کی بدولت بعض نام نہاد مذہبی فیلسوفی فرقے بجائے معدوم ہونے کے اور تقویت پا گئے، اول الذکر قسم مین خصوصیت کے ساتھ قرمطی یا اسمٰعیلی مذہب نے اشاعت

---

[1] لیوی، اخبار بغداد صفحہ ۱۴۹، بعض مرتبہ شافعی لوگون کو ڈنڈون سے اتنا مارا گیا کہ دم بہ لب ہو گئے،
[2] گبن، سلطنت روما کا عروج و زوال، جلد ششم باب ۵۲ صفحہ ۶۲ واقعات منقول از ابن اثیر جلد ہشتم صفحات ۲۲۹ و ۲۳۰،
[3] لیوی، اخبار بغداد صفحات ۱۴۹-۱۵۰،

حاصل کی جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی ایک رقیب سلطنت شمالی افریقہ اور مصر مین دولتِ فاطمیہ کے نام سے قائم ہو گئی، اسی طرح فلسفیانہ اختلاف کی شدت اس جماعت کی بانی ہوئی جو اخوان الصفا کے نام سے مشہور ہے۔[1]

زنگی بغاوت نے جو زیدی تحریک کا نتیجہ تھی[2]، ثابت کر دیا کہ شیعیانِ علی کو علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کر دینا کس قدر آسان ہے، اور اس قسم کی کوشش کے لئے جنوبی عراق کے مقامی حالات کس درجہ موافق ثابت ہون گے۔ ابھی تک عباسیون کو اس سے زیادہ خطرناک بغاوت کا سامنا نہ ہوا تھا، تقریباً چودہ سال تک (سنہ ۲۵۶ ۔ سنہ ۲۷۰ ھ ۸۶۹ء ۔ ۸۸۳ء) خلفا کو اس شورش نے خوف اور تشویش مین مبتلا رکھا، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ فارس کے صوبے سرکش ہو رہے تھے، قطعی ممکن تھا کہ موفق اور اس کے بیٹے ابوالعباس کا قوی ہاتھ سرکش صفاریون کو فنا کر دیتا، اور خلافت کا کھویا ہوا شکوہ و جلال پھر قائم ہو جاتا، لیکن زنگیون کی طویل اور سخت جان بغاوت نے صفاریون کے خلاف کامیاب نہ ہونے دیا،

یہ فتنہ جاری تھا کہ سنہ ۲۶۰ھ ۸۷۳ء مین ایک اسمٰعیلی عبداللہ بن میمون القداح نے ایک نئی شیعی تحریک شروع کر دی[3]، اس کے اغراض و مقاصد زیادہ خطرناک اور اس کے عواقب عباسی خلافت کے لئے کہین زیادہ مہلک ثابت ہوئے، سنہ ۲۹۷ھ ۹۰۹ء مین عبداللہ کے

---

[1] براؤن، تاریخ ادبیات ایران، جلد اول صفحہ ۳۳۹ [2] طبری جلد سوم صفحہ ۱۷۴۲، ابن اثیر جلد ہفتم صفحہ ۱۳۹، [3] براؤن، تاریخ ادبیات ایران، جلد اول صفحہ ۳۹۴، منقول از فہرست صفحہ ۱۸۶-۸۷

پوتے سعید بن الحسین کو شمالی افریقہ سے حسب مراد کچھ اطلاعات پہنچیں، چنانچہ سعید افریقہ پہنچ
اور بنو اغلب کی حکومت برباد کر کے فاطمی خلافت کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوا[1] ۲۵۶ھ/۹۰۹ء
میں اس کی جماعت نے اخشیدیوں[2] سے مصر بھی لے لیا، اس صورت سے شیعی تحریک گو عباسی
خلافت کو فنا نہ کر سکی مگر ایک حریف خلافت قائم کر دینے میں کامیاب ہو گئی، مقابلہ میں
ایک دوسری خلافت کا وجود میں آجانا جس کے حدود میں مقاماتِ مقدسہ بھی داخل تھے
عباسی اقتدار کے لئے ضرب کاری تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ تنہا عباسیوں کو مذہبی قیادت کا جو
اجارہ حاصل تھا جاتا رہا،

اس تحریک نے اسی پر قناعت نہ کی، خود عباسی قلمرو میں اس کے پسماندہ اثرات
کام کرتے رہے، ایک شخص ہمدانی بن اشعث نے پھر اسماعیلی عقائد کی تبلیغ شروع کی، ہمدان
کو اہانۃً قرمط کے لقب سے موسوم کیا جاتا تھا، اور اسی لقب سے لفظ قرمطی ماخوذ ہے، قرمطیوں
نے الاحسا میں عباسی خلافت سے آزاد ایک ریاست قائم کر لی، اور ان کے مبلغین
نے خراسان، شام اور یمن میں شورش انگیزی کے مستقل مرکز بنا لئے[2]، قرمطی ایک سیاسی
طاعون تھے جو عباسی ممالک پر ہاتھ صاف کرتے، اور حاجیوں کے قافلے لوٹنے کیلئے
ہر وقت کمربستہ رہتے تھے، المکتفی کے عہد میں (۲۸۹ھ-۲۹۵ھ؍ ۹۰۲ء-۹۰۸ء) کہ سے آنے
والے حجاج کو متعدد مرتبہ انھوں نے پریشان کیا اور تاخت و تاراج کا یہ سلسلہ کبھی کبھی

---

[1] براؤن، تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۹۴ منقول از فہرست صفحہ ۱۰۷-۱۰۶-
[2] ماسینیان، مضمون برعنوان قرمطی، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام،

جوار بغداد تک پہنچ گیا[1]، یکے بعد دیگرے چند فتوحات حاصل کرنے کے بعد وہ شام پر قابض ہو گئے، اب اسلام کا مرکز زیادہ دور نہ رہا،

۳۱۷ھ / ۹۲۹ء میں انھون نے خود مکہ پر حملہ کیا اور سنگ اسود اٹھالے گئے، جس سے مسلمانون میں بڑا ہیجان پھیل گیا، یہ مقدس پتھر بیس سال تک ان ہی کے قبضے مین رہا[2]، دس سال بعد پھر اطلاعین ملین کہ حجاج کے قافلون پر قرمطی دست درازیان کر رہے ہین، ان کی خطرناک تگ و تاز آخر تک ختم نہ ہوئی، اس خطرے نے خلفاے بغداد کو مسلسل مصروف رکھا جس کے باعث صوبہ دارون مین بغاوت کے حوصلے بڑھ گئے، چنانچہ بغداد کے زوال مین قرمطیون کا حصہ بھی کم نہ تھا،

اس عہد کی دوسری خصوصیت ترکی عروج ہے، یہ لوگ حالات کے اقتضار سے عباسی خلافت کے مالک مطلق بن گئے تھے، بری گھڑی تھی جس دن معتصم (۲۱۸ھ - ۲۲۷ھ / ۸۳۳ء - ۸۴۲ء) نے فوج مین ترکی عنصر داخل کیا تھا، آخر ترکی سردارون کے ظلم، سرکشی اور ان کی روز افزون تعداد سے ڈر کر[3] ۲۲۱ھ / ۸۳۶ء مین مستقر خلافت بغداد سے سامرہ[4] کو منتقل کیا گیا، اس انتقال نے خلیفہ کی ذات کو اور بھی خطرے مین ڈالدیا، اب وہ اہل بغداد سے دور، وحشی اور خود غرض سفاکون کے نرغہ مین گھرا ہوا تھا، اس وقت یہ اندیشہ اور بھی زیادہ قوی ہو گیا کہ ترکی اثر خلیفہ کو محکوم بناکے رہے گا، سامرہ پہنچکر ترکون نے بہت آسانی کیساتھ

[1] ابن اثیر جلد ہفتم صفحہ ۳۰۶، [2] مسکویہ ۱ ص ۲۰۱ - ایکلپس مترجم - ۴ ص ۲۲۶، ابن اثیر ۸ صفحہ ۱۵۳، [3] ابن اثیر ۶ صفحہ ۳۱۹ [4] سامرہ کی اصل سُرَّ مَنْ رَاٰی ہے، اسکے معنی "جس نے دیکھا خوش ہوا"، مگر بغدادیوں نے اسکی تعبیریوں کی کہ "جس کسی نے اسکو (ترکوں سے آباد) دیکھا وہ خوش ہوا کہ بغداد ترکوں سے پاک ہو گیا"۔ ملاحظہ ہو میور کی خلافت صفحہ ۵۰۹،

خلیفہ گری کا منصب حاصل کر لیا، ہر نئی تخت نشینی پر ان کے اختیارات مین اضافہ ہوتا رہا معتصم نے جس فتنہ کا بیج بویا تھا اس کے تلخ ثمر متوکل کو چکھنا پڑے، مذہبی دارو گیر شروع کر کے متوکل نے رعایا کے اکثر طبقون کو منحرف کر دیا تھا، اس کی سختی نے خود اس کے بیٹے کو ترکی غدارون کا شریکِ راز بنا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۴۷ھ مین[1] متوکل کو جان دینا پڑی، یہ سچ ہے کہ پدرکش فرزند سازش کے ثمرات سے متمتع ہونے کے لئے عرصہ تک زندہ نہ رہا، مگر اس فعل کے نتائج اس کے بعد آنے والون کے لئے خطرناک ثابت ہوئے، یہ پہلا موقع تھا کہ ترکون نے خلیفہ کی ذات پر ہاتھ ڈالا تھا، چنانچہ اس نظیر نے بہت سی ناروا کارروائیون کا دروازہ کھول دیا، کسی کے سر پر تاج رکھا گیا، تو کسی کو معزول کیا گیا، بہت سی آنکھین بصارت سے محروم ہوئین، تو بہت سے خون ناحق بہائے گئے، خلیفہ کی ذات کو جس احترام کے ساتھ دیکھا جاتا تھا[2] اس کے حق مین یہ مثال سمِ قاتل ثابت ہوئی، اب خلیفہ کے سامنے انتہائی ذلت کا سلوک ہونے لگا،[3] الفخری کے مصنف نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکون کو اس وقت خلفاء پر واقعی کتنا اقتدار حاصل ہو گیا تھا، وہ کہتا ہے

جب معتز خلیفہ ہوا تو اہل دربار نے جمع ہو کر کسی نجومی کو بلایا اور دریافت کیا کہ خلیفہ کبتک زندہ اور مسند خلافت پر متمکن رہے گا، مجمع مین کوئی زندہ دل بھی موجود تھا، اس نے کہا مین اس کا جواب منجم سے بہتر دے سکتا ہون، چنانچہ اس سے دریافت کیا گیا تو اس نے جواب

---

[1] طبری ۳ ص ۱۴۵۹-۱۴۶۰، [2] مگر ملحوظ رہے کہ خلفاء کی بدنصیبیون کے ساتھ منصب خلافت کو شریک نہ کرنا چاہیے۔
[3] ترکون نے معتز کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ پانون پکڑ کر اسکو گھسیٹ لائے اور قمیص اتار کر دھوپ میں کھڑا کر دیا، زمین تپ رہی تھی، خلیفہ کبھی ایک پانون اٹھا لیتا تھا کبھی دوسرا، اور ترک طمانچے مارتے تھے آخر اسکو قتل کر دیا گیا۔ ملاحظہ ہو طبری ۳ ص ۱۷۰۹

دیا کہ "جب تک ترک چاہیں گے"۔ اس فقرے پر حاضرین کو ہنسی آگئی۔[۱]

دارالخلافہ پھر بغداد کو منتقل ہوا، موفق اور اس کے بیٹے خلیفہ معتضد کی قوی شخصیت نے پھر برائے چندے خلافت کے ناتوان جسم میں جان ڈالدی، مگر باایں ہمہ ترکوں کی قوت فنا نہ ہوسکی، یہ صحیح ہے کہ ان کا اقتدار بہت کم ہوگیا، مگر باوجود اس کے اس عہد کے اکثر سربرآوردہ وزراء ان کی اعانت کے محتاج رہے، وزارت کا منصب ایک آنی جانی چیز سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ہر وزیر نے حکومت کے فائدے سے زیادہ ذاتی منفعت مدنظر رکھی، اس کلیہ سے اگر کوئی مستثنیٰ رہا تو ایک علی بن عیسیٰ جو اس لحاظ سے عزت و احترام کا مستحق ہے، اس زمانہ میں عمالِ حکومت کا مقصد اولین جمع زر ہوتا تھا، رشوت ستانی کے الزام، معزولی اور جائداد کی ضبطی آئے دن کے معمول تھے، یہاں تک کہ یہ مدحکومت کی آمدنی کا ذریعہ بن گئی تھی، اور اس کا انتظام کرنے کے لئے ایک جدا محکمہ وجود میں آگیا تھا،[۲]

ابن الفرات جو اس عہد کے سرآمد وزراء میں شمار ہوتا تھا، کہا کرتا تھا کہ "خلیفہ کے کاروبار کو متحرک رکھنا چاہیے، وہ حرکت غلط سمت ہی میں کیوں نہ ہو، اس سے بہتر ہے کہ وہ صحیح مقام پر قائم اور ساکن رکھے جائیں"[۳] اس قول سے سلطنت کے اکابر و اعیان کی سیرت کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے، مختصر یہ ہے کہ ارکانِ سلطنت کی ساری جماعت اس قدر دیانت سے خالی ہوگئی تھی کہ ایماندار آدمی کو سرکاری ملازمت کرنی محال تھی، باوجود اس کے کہ علی بن عیسیٰ

---

[۱] الفخری لابن الطقطقی ص ۳۳۳ ، [۲] تاریخ تمدن زیدان مترجمہ مارگولیتھ صفحہ ۲۳۳، منقول از کتاب الوزراء ہلال الصابی صفحہ ۳۰۶، [۳] ایضاً صفحہ ۲۳۲، منقول از کتاب الوزراء ہلال الصابی صفحہ ۱۱۹ ۔

جیسی مدبر شخصیت سلطنت کے لئے ناگزیر تھی لیکن خلیفہ مقتدر نے ناجائز اثرات قبول کئے اور علی کو متعدد مرتبہ معزول کر کر دیا[1]،

مقتدر ۳۲۰ھ/۹۳۲ء میں قتل کر دیا گیا، اور اس کے بعد عباسیہ کے زوال کا آخری دور شروع ہو گیا، ترکی فریق پھر غالب ہوا، اور ۲۴۷ھ/۸۶۱ء میں متوکل کے خون کے بعد جو تماشہ نظر آیا تھا وہی منظر پھر سامنے آنے لگا، حالات کی یہ صورت دیکھکر بہت سے حکمران امیرون نے چاہا کہ بغداد کو زیر اثر لے لیں، اور خلیفہ کو پتلی کی طرح ہاتھ میں رکھکر سلطنت پر حکمرانی کریں، چنانچہ دربار بغداد پر اقتدار حاصل کرنے کی خاطر رقیبانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں، ان حریفون میں سے اکثر امیر الامراء کے منصب پر فائز رہے، جو مخصوص طور پر ان ہی کے لئے وضع کیا گیا تھا، وزیر کے اکثر اختیارات امیر الامراء کو تفویض ہو جانے کے بعد وزارت کی وہ اہمیت اور شان رخصت ہو گئی، اب وزیر کے اختیارات سماعت صرف ان لوگون کے قضیون تک محدود تھے، جنکا حکومت سے کوئی تعلق نہ ہو، جن معاملات میں حکام یا سپاہی فریق ہوتے تھے، ان کا فیصلہ خلیفہ کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے وزیر نہ کر سکتا تھا، بلکہ اب ایسے مقدمات کو امیر کا معتمد سنتا تھا[2]، ان بوالہوس امراء نے خلیفہ کا روزینہ مقرر کر دیا تھا، اور تمام محاصل خود صرف کرتے تھے[3]، اس کے ماسوا ایک نئی رسم یہ شروع ہوئی کہ جمعہ کے خطبے اور سکوں میں خلفاء کیساتھ

---

[1] مسکویہ ۱۰۱ صفحہ ۴۰، ۱۴۱، ترجمہ ایکلیس باب چہارم صفحہ ۵۴، ایک مرتبہ علی کی معزولی اس جرم میں واقع ہوئی کہ وہ برخاست شدہ عہدہ داروں سے حسب دستور جرمانے وصول نہ کر سکا تھا، ملاحظہ ہو بودین کی تصنیف علی بن عیسیٰ صفحہ ۱۴۵ بحوالہ کتاب الوزراء ہلال الصابی صفحہ ۷۹، علی نے اس مطالبہ کا یہ جواب دیا کہ میں ان عہدہ دارون پر اعتماد کرتا تھا، اب ظلم نہیں کر سکتا، ملاحظہ ہو مسکویہ باب اول ص۲۴۱ ایکلیس ترجمہ جلد چہارم صفحہ ۲۹۶، [2] علی ابن عیسیٰ مصنفہ بودین بحوالہ ہلال الصابی ص۳۱۷، [3] مسکویہ جلد ا ص ۳۵۲ ایکلیس کا ترجمہ جلد نہم، ص ۳۹۶،

ان کے نام بھی آنے لگے۔[1]

خلیفہ کے اختیارات کچھ نہ رہے تھے، پھر بھی دیندار مسلمان اس کا ادب کرتے تھے، اور ان کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں، اب بھی اس کے احکام کی علانیہ خلاف ورزی خطرے سے خالی نہ تھی، کیونکہ حکم عدولی کرنے والا عوام کی ہمدردی سے محروم ہو جاتا، اس سبب سے حصولِ اختیار کے لئے ضروری تھا کہ حقیقی حکمرانی کو بطرز احسن نمایشی محکومی کا رنگ دیا جائے، خلفا سلطنت کے نظم ونسق کے ذمہ دار ضرور تھے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا، احکام اُنہی کے قلم سے جاری ہوتے تھے، مگر جنبشِ قلم با اثر امرا کے اشارون کی تابع تھی،

فقہائے اسلام نے خلافت کی جو شرعی حیثیت قائم کی ہے اس کو دیکھئے اور اس وقت عملاً اس منصب کی جو حیثیت رہ گئی تھی اس کو دیکھئے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس بے قاعدہ صورتِ حال مین جو دار الخلافت اسلامی مین اس وقت موجود تھی، خلیفہ کا وجود ایک کھلونے سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا، تحقیق کی راہ مین منجملہ اور دشواریون کے ایک دقت یہ حائل ہے کہ علی بن محمد الماوردی (۳۸۱ھ ۹۹۱ء م ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء) سے پہلے منصب خلافت کی تشریح کسی نے نہین کی، اور اگر کی تو اب موجود نہین ہے، ماوردی کی تصنیف احکام السلطانیہ پانچوین صدی کے ثلث اوّل مین وجود مین آئی، اگرچہ اس کتاب کی تصنیف

---

[1] ابن اثیر جلد ۸ صفحہ ۲۷۱، حکم ہوا کہ ہر مسجد مین ابن رائق کا نام پڑھا جائے، بجکم اور توزون دونون کے نام بغدادی دار الضرب کے سکون پر ملتے ہین، ملاحظہ ہو لین پول کی تصنیف اسلامی حکمرانون کے سکے "صفحہ ۱۹ وضمیمہ جات صفحہ ۲۵"،

ایسے دور میں ہوئی جب کہ خلیفہ اختیارات سے محروم ہوچکا تھا، لیکن اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اصولی مسائل کا تعلق ہے، منصب خلافت کے متعلق ماوردی کی تشریحات، دورِ سابق سے تعلق رکھتی ہیں، چونکہ آل بویہ کے عہد سے پہلے منصب خلافت کے متعلق کسی ہمعصر مصنف کا بیان موجود نہیں، اور چونکہ ماوردی نے اپنے براہین اور نتائج کی بنیاد گذشتہ روایات اور سابق فقہا کی آرار پر قائم کی ہے، لہٰذا یہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا کہ ماوردی کا نظریۂ خلافت (وہ خصوصی پہلو جنہیں دستورِ وقت کا اثر جھلکتا ہے نظر انداز کر دینے کے بعد) دراصل ان فقہا کا نظریہ ہے جو آلِ بویہ سے پہلے گذر چکے تھے۔[1]

ماوردی کے بقول انصرام امور دنیوی اور بقاے دین کے لئے ایک قائد کی ضرورت ہے اور رسول کے بعد ایسا قائد پیدا کرنے کے لئے خلافت کا منصب ضروری ہے، اس کے نزدیک قوم پر فرض ہے کہ بہ اتفاق رائے امام مقرر کرے، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس دور میں خلفاء کے انتخاب میں بحیثیت مجموعی قوم کو سرمو بھی دخل نہ رہا تھا، لیکن رسم قائم رکھنے کی خاطر برائے گفتن عامۃ الناس سے بیعت پھر بھی لیجاتی تھی، بجاے اس کے کہ اہل ملت کے اتفاقِ رائے سے خلیفہ کا انتخاب ہوتا، قوم کا دخل صرف اس قدر رہ گیا تھا کہ طوعاً یا کرہاً منتخب شدہ خلیفہ کی اطاعت کا حلف لے لے، یہ رسم نمایشی تھی، لیکن انتخاب کی تکمیل کے لئے ضروری تصور ہوتی تھی، قضاۃ اور دیگر عمائد کے حلف کو زیادہ اہمیت دیجاتی تھی، مگر یہ لوگ حلف لینے میں کافی احتیاط کرتے تھے اور احکام شریعت سے سرمو تجاوز

[1] اس نظریہ کی تفصیلی تشریح ہمارے موضوع کے حدود سے باہر ہے،

کرنا نہ چاہتے تھے۔

مصنف مذکور کہتا ہے کہ انتخاب کے وقت ایک طرف تو وہ لوگ ہوتے ہین جنکو انتخابِ امام کا حق حاصل ہے اور دوسری جماعت ان شخصون کی ہوتی ہے جو انتخاب کے امیدوار ہوتے ہین انتخاب کرنے والون مین ذیل کی تین صفتین ہونی چاہئین، (۱) دیانت ہر معنی اور ہر اعتبار سے، (۲) امام کے ضروری اوصاف سمجھنے کی استعداد، (۳) قوتِ فیصلہ اور اصابتِ رائے تاکہ وہ منصبِ امامت کے لئے مناسب ترین فرد کو منتخب کر سکین، تحقیقتی ا انتخاب کرنے والے ترکی سردار اور وزراء ہوتے تھے، ان مین سے بڑی تعداد خود غرض، بے اصول اور ہر اعتبار سے دیانت سے معرا ہوتی تھی، اوصاف دوم وسوم کی کمی ان مین نہ ہوتی تھی لیکن شرط اول مفقود ہونے کے سبب بقیہ دو کا جائز استعمال بھی نہ کر سکتے تھے انتخابِ خلیفہ کے مسئلہ مین وہ اپنی خواہشات پر نظر رکھتے نہ کہ خلیفہ کے اوصاف پر،

منصبِ خلافت کی اہلیت ماوردی کے نزدیک ذیل کی شرائط پر منحصر ہے، (۱) ہر اعتبار سے متدین ہو (۲) فقہ سے واقف ہو تاکہ پیچیدہ معاملات مین شرعی مسائل سمجھ سکے، (۳) نطق، سماعت اور بصارت صحیح رکھتا ہو، (۴) تندرست ہو، (۵) وہ ذکاوت اور دانائی رکھتا ہو جو فرمانروائی خلق اور انصرامِ مہماتِ ملکی کا شعور پیدا کر سکے، (۶) جری اور دلیر ہو تاکہ حدودِ سلطنت کا تحفظ اور اعداء اسلام کی تخویف کر سکے، (۷) قریشی نسب ہو، چونکہ عموماً خلافت کا منصب وراثۃً منتقل ہوتا تھا، انتخاب کا میدان تنگ رہتا تھا، منتخب کرنے والون کو در اصل خلیفہ متوفی یا معزول ہی کے بیٹون اور بھائیون مین سے کسی کو نامزد کرنا پڑتا تھا، اس محدود تعداد

مین بھی خلیفہ کے ضروری اوصاف پر نظر نہ کی جاتی تھی، جواز اور باضابطگی کا رنگ دینے کے لئے، ایک نمایشی کارروائی عمل مین لائی جاتی تھی، اعیانِ دربار، سردارانِ عساکر اور پیشوایانِ مذہب کا اجتماع ہوتا تھا جس کا مقصد مذکورۂ بالا شرائط پر غور کرنا ہوتا تھا، مگر اس اجتماع سے قبل ہی ذی اثر حضرات فیصلہ کر چکتے تھے، شرائط سوم و چہارم اس تمام عہد مین ہمیشہ ملحوظ رکھی گئین ان پر اعتقاد اتنا راسخ تھا کہ کسی مدعی خلافت کا آنکھون سے محروم ہو جانا اس کے حقوق کا خاتمہ کرنے اور تاج و تخت سے محروم رکھنے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا، ساتوین شرط اشد ضروری تھی اور اتنی ہی سختی کے ساتھ اس کی پابندی ہوتی تھی، اہلسنت کا اس شرط پر اتنا کاربند رہنا چند احادیث کی بنا پر تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی تھین، خاص عباسی خاندان کے حق مین چند اور احادیث وضع کر لی گئی تھین جن سے ان کی حکومت کا مزید استحکام ہو گیا تھا، انھی احادیث کا اثر تھا کہ ترک سردار مختار کل ہونے کے باوجود بھی نسلِ عباسؓ سے باہر کسی شخص کو مسندِ خلافت کے لئے پیش نہ کر سکے، اس اختصاص نے دودمانِ عباسیہ کو اہلسنت کی نگاہ مین ایک گونہ مقدس بنا دیا تھا، اور اسی باعث بہ استثنائے ہسپانیہ مسلمانون کے تمام سنی ممالک مین سیاسی اتحاد کی ایک نمود قائم رہی

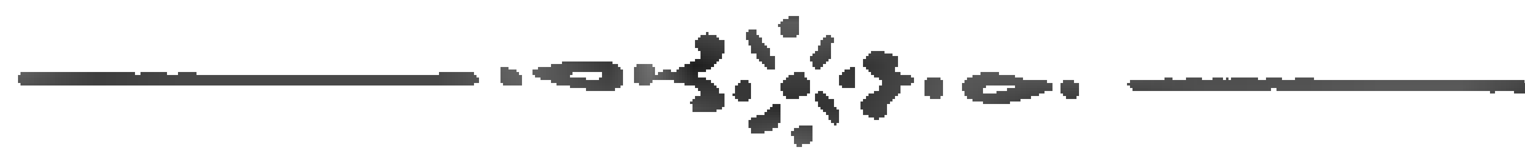
ماوردی خلافت کو ناقابل تقسیم سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے "بیک وقت ایک سے زائد امام نہین ہو سکتے"، اہل سنت اس اصول پر سختی سے کاربند رہے، جس سے خلافت کے ادارے کو اور بھی زیادہ تقویت پہنچی، خلافت کے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہونے سے شخصی حکومت کی جو شکل پیدا ہو گئی تھی، اس پر جواز کی مہر ثبت کرنے کے لئے ماوردی اس دستور کو جائز تصور

کرتا ہے کہ خلیفہ اپنا جانشین خود نامزد کردے،

ماوردی کے نزدیک خلیفہ کے دس فرائض ہیں، (۱) دین اسلام کے اصول بلند و بالا کرنا، (۲) نزاعات اور مقدمات فیصل کرنا، (۳) ممالکِ اسلامی کی حفاظت کرنا، (۴) حدودِ سیاست جاری کرنا، (۵) سرحدی علاقوں میں تحفظ کے لئے سامانِ حرب فراہم کرنا اور سپاہ رکھنا، (۶) اُن لوگوں سے جہاد کرنا جو قبولِ اسلام سے انکار کریں یا بحیثیت ذمی اطاعت پر راضی نہ ہوں، (۷) حسب احکامِ شریعت محاصل لگانا، (۸) بیت المال سے سالانہ وظیفے تقسیم کرنا، (۹) مختلف اضلاع میں بندوبست محاصل اور نظم و نسق ملکی کے لئے معتمد اشخاص اور مشیر مقرر کرنا، (۱۰) کاروبارِ سلطنت کی نگرانی کرنا اور بچشم خود حالات کا معائنہ کرنا، اگر خلیفہ ان فرائض کو بجا لاتا تھا تو رعایا کے ذمہ دو فرض تھے، اول اطاعت اور دوم اعانت، ظاہر ہے کہ اس دورِ انحطاط میں کسی خلیفہ نے فقہا کے قائم کئے ہوئے سب فرائض نہ انجام دیئے نہ دیسکتا تھا، لیکن قصور وار خلیفہ کو معزول کرسکنے کا اختیار کبھی استعمال نہ کیا گیا، سبب یہ تھا کہ اس حق سے فائدہ اٹھانے کی قوت ہی نہ تھی، دوسرے جو اہلِ غرض اکابر خلیفہ کو سریرِ سلطنت پر بٹھاتے تھے ان کی اعانت اور حمایت عزل کو ناممکن بنا دیتی تھی، دو خاص چیزیں تھیں جو منصبِ خلافت سے محروم کردیتی تھیں ایک فسخ اخلاق اور دوسرے جسمانی نقائص، اول الذکر قصور پر معزول کردینے کا اختیار اہلِ غرض فریق کے لئے ایک عمدہ حربہ تھا، جب تک خلیفہ اس فریق کے مطالبات بہ سروچشم قبول کرتا رہتا تھا، اخلاق کوئی نہ پوچھتا، مگر جس آن وہ اس جماعت سے متحد نہ رہتا اخلاق کی پرسش شروع ہو جاتی، اور اس سے

درخواست کی جاتی کہ تخت سے خود دست بردار ہو جائے، اس کو مجبوراً رضامند ہونا پڑتا تھا اور قضاۃ اس پر گواہ ہوتے تھے، اس کے بعد خلیفہ کو ایک جلسہ کے سامنے اپنے عزل کا اعلان کرنے کے لئے حاضر کیا جاتا تھا، اگر کوئی خلیفہ ذی اختیار جماعت کی تجویز سے انحراف کرتا تو قتل کی دھمکیاں دی جاتیں یا آنکھوں سے معذور کر دیا جاتا،

صورتِ حال یہ ہو تو یہ توقع فضول ہے کہ صوبہ دار خلافت کی فرمانبرداری کا فرض کما حقہٗ ادا کرتے ہوں گے، ایران میں سب سے پہلے طاہریوں نے خودمختار ریاست قائم کی، دربارِ خلافت اور طاہریہ ریاست کے باہمی تعلقات سے اگلے باب میں بحث کی جائے گی،



دوسرا باب ۲

طاہریہ اور خلافت

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس ریاست کا بانی طاہر ذوالیمینین تھا، طاہر کا سلسلہ نسب رازق سے ملتا ہے جو ابو محمد طلحہ عبداللہ الخزائی والی سیستان کے یہاں ملازم تھا، اس کا بیٹا مصعب صوبہ بیروت کے شہر بوشنگ کا حاکم اور عباسی سفیر سلیمان بن کثیر الخزائی کا منشی تھا، اس کے مرنے کے بعد بوشنگ کی حکومت اس کے بیٹے حسین کو (سنہ ۱۹۹ھ ۸۱۴-۸۱۵ء) اور پھر اس کے پوتے طاہر کو تفویض ہوئی، طاہر بعد کو خلیفہ مامون کی ملازمت میں آگیا، یہ امر مسلّمہ ہے کہ مامون کو امین کے مقابلہ میں جو فتح حاصل ہوئی وہ اسی سپہ سالار کی سعی بلیغ کا نتیجہ تھی، قدرتی طور پر مامون نے جلیل ترین عہدے طاہر اور اس کے اہل خاندان کو عنایت کیے، مامون کے تخت خلافت پر پہنچنے کے بعد (۱۹۸ھ ۸۱۳ء) طاہر الجزیرہ کا حاکم اور سواد کا محاسب مال مقرر ہوا، اور بغداد کے حربی سرداروں میں اس کا نام شامل کیا گیا، اس کے بیٹے عبداللہ کو سلطنت کے مغربی علاقوں میں امن قائم کرنے کی خدمت سپرد ہوئی

خزرمی

۲۰۶ھ / ۲۱-۸۲۲ء مین عبداللہ کو اُس صوبہ کا والی بنایا گیا جو رقہ اور بصرہ کے درمیان واقع ہے، اسی کے ساتھ امین کے ایک رفیق نصر بن شبث کے خلاف جو سپاہ روانہ ہوئی اس کی سپہ سالاری پر بھی عبداللہ کو نامزد کیا گیا، ۲۰۹ھ / ۲۵-۸۲۴ء مین نصر نے خود کو عبداللہ کے حوالہ کر دیا، اسی سال (۲۱۰ھ / ۲۶-۸۲۵ء) وہ مامون کے حکم سے مصر گیا، وہان کی شورش ٹھنڈی کی اور اسکندریہ کو خلافت کے زیر نگین لے آیا،

عباسی سلطنت کی فتح اور استحکام دونون طاہریون کی وفاداری اور حسن خدمت کا ثمر تھے، چنانچہ ان کو شریک سلطنت ہونے کی عزت ملی، مامون ان کی خدمات کی قدر کرتا تھا اور اعلیٰ اعلیٰ عہدے دے کر کافی صلہ دیتا تھا، لیکن یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھتا تھا کہ وہ اپنے وطن خراسان سے دور ہی رہین، اگرچہ اس خطہ کی پر شورش فضا مقتضی تھی کہ فتنہ فرو کرنے کے لئے مزید توجہ سے کام لیا جائے اور طاہری سردارون کو اس مہم پر مامور کیا جائے، لیکن اس علاقہ مین طاہریون کا اتنا اثر تھا کہ بیجا استعمال ہو کر سلطنت کے لئے خطرناک بن سکتا تھا،

طاہر کے حوصلے بلند تھے، وہ بغداد رہ کر اس منصب پر قناعت کرنا نہ چاہتا تھا، اس کو خراسان کی حکومت کا شوق تھا، چنانچہ خود اس کا قول اس بیان کی تائید کرتا ہے، کسی نے طاہر کو دعا دی کہ "خدا تمھین یہ عزت مبارک کرے، خراسان مین تمھارے جتنے ہم چشم تھے، ان مین کوئی بھی اس مرتبہ کو نہ پہنچا" یہ سنکر طاہر نے جواب دیا کہ مجھے اس سے مسرت نہین ہوتی، کیونکہ یہان بوشنگ کی وہ بوڑھی عورتین نظر نہین آتین جو چھتون کے

چڑھ چڑھ کر مجھے دیکھا کرتی تھیں" لیکن اس کے باوجود طاہر کا بغداد سے چلا جانا خود مامون کے طرز عمل کا نتیجہ تھا مشہور ہے کہ ایک روز طاہر کو دیکھ کر مامون کے دل مین امین کی یاد تازہ ہوگئی جس کو طاہر نے قتل کیا تھا، بھائی کی محبت مین مامون کی آنکھون سے آنسو بہنے لگے، اس واقعہ نے طاہر کو مشتبہ کر دیا جب اس کو معلوم ہوگیا کہ مامون کے آنسو کیون نکلے تھے اور مامون کے قلب مین اس کی طرف سے کیسی نفرت تھی تو وزیر کی امداد سے خود کو خراسان کی حکومت پر مامور کرالیا، یہان اس کا اثر موجود تھا اور خاندانی تعلقات کی بنا پر امداد کی امید تھی، مامون کو طاہر پر اعتماد باقی نہ رہا تھا، اس کا ثبوت بس یہی واقعہ کافی ہے کہ پہلے طاہر کو مشرقی صوبہ پر تعینات کرنے کے لئے وہ راضی نہ ہوتا تھا، مگر وزیر کے فریب نے مامون کی رضا حاصل کرلی، پھر بھی مامون نے خراسان کی حکومت اس شرط پر عنایت کی کہ طاہر کے طرز عمل کا وزیر خود ضامن بنے، مامون کی طرف سے طاہر کے خلاف شدید عداوت کا اظہار ہوا اور بہ ظاہر یہی باعث تھا کہ سنہ ۲۰۷ھ/۸۲۲ء مین طاہر نے خطبے سے مامون کا نام خارج کرکے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ عباسی خلافت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا، طاہر کی یہ دیوانہ وار بغاوت ظہور مین آتے ہی فنا ہوگئی کیونکہ اچانک قدرت کے ہاتھ یا زہر کی طاقت نے طاہر ہی کو دنیا سے اٹھا لیا، کہا جاتا ہے کہ زہر دینے والی ایک کنیز تھی جو مامون نے عنایت کی تھی اور جس کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ طاہر کو ہلاک کر دے،

باپ کی جگہ طلحہ کا تقرر غالباً اس مصلحت پر مبنی تھا کہ طاہر کی ناگہانی موت سے جو شبہات

پیدا ہو رہے تھے، مسدود ہو جائیں۔ طلحہ کے بعد اس کا بھائی عبداللہ بن طاہر حکومت پر مامور ہوا۔ اس تقرر نے وراثت کا حق قائم کر دیا، اور مقامی اثر اور اقتدار اتنا بڑھا دیا کہ کسی سابق حاکم کو نصیب نہ ہوا تھا، یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ عبداللہ کا تقرر نوازشِ خسروی کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ خود عبداللہ کی قابلیت کا انعام تھا، علاوہ ازیں مامون اس پر پورا اعتماد کرتا تھا اور بڑے اعزاز کے ساتھ پیش آتا تھا، مگر عبداللہ بن طاہر کے دور میں اس خاندان کا عروج انتہا کو پہنچ گیا اور اس کے قدم ایسے جم گئے کہ کسی دوسری جگہ کی حکومت پر تبدیل کرنا دشوار ہو گیا۔ خلیفہ معتصم کو اس سے رنج تھا، مگر معتصم کو بھی برطرف کر دینے کی جرأت نہ ہوئی، وہ عبداللہ کا خاتمہ کرنے کے لئے قتل کی خفیہ تدبیر کرتا رہا، اس کے برخلاف عبداللہ سے بنو عباس کو جو توقعات تھیں وہ پوری ہوتی رہیں اور اس نے ثابت کر دیا کہ جو اعتماد اس پر کیا جاتا تھا، اس کا اہل تھا، اس وقت بھی جب کہ اس کو معتصم کی سازش کا حال معلوم ہوا، اس نے وہ طرزِ عمل نہ اختیار کیا جو اسی قسم کے حالات میں اس کے باپ نے کیا تھا، تاہم یہ احتیاط کرنے لگا کہ زیادہ مدت تک ملک سے باہر نہ رہتا تھا، وطن ہی میں وہ اپنی جان محفوظ سمجھتا تھا، اسی سبب سے عبداللہ کو باوجود اپنی دین داری کے زیارتِ کعبہ کے شرف سے محروم رہنا پڑا۔

عبداللہ بن طاہر کی موت کے بعد (۲۳۰ھ) خلیفہ واثق نے اسحٰق بن ابراہیم مصعبی کو خراسان کی حکومت تفویض کی، مگر عبداللہ اپنے نئے عہدے کا کام لینے کے لئے روانہ بھی نہ ہوا تھا کہ تقرر منسوخ ہو گیا، اور طاہر بن عبداللہ کو باپ کی جگہ مامور کیا گیا، ۲۴۸ھ میں آخری تقرر محمد بن طاہر کا ہوا، اور یہ تقرر ان خدماتِ جلیلہ کے صلے میں عمل میں آیا، جو عبداللہ اور

اس کے اہلِ خاندان بجا لائے تھے. اس بیان سے ظاہر ہے کہ حالات کے اقتضا نے خراسان
کی حکومت طاہر کے خاندان سے باہر نہ جانے دی، یہان تک کہ ۲۵۹ھ ۸۷۲ء مین یعقوب بن
لیث نے اس کا خاتمہ کر دیا،

طاہری حکمران سالانہ خراج کی ایک معین رقم دربارِ خلافت کو بھیجتے رہتے تھے،
ابن خرداذبہ کے بقول ۲۱۱ھ ۸۲۶ء - ۲۱۲ھ ۸۲۷ء مین عبداللہ نے جو خراج پیش کیا وہ چار کروڑ
اڑتالیس لاکھ چھیالیس ہزار درہم ۱۳ اراس شایستہ گھوڑون، دو ہزار بھیڑون اور دو ہزار غلامون
پر جن کی قیمت ساٹھ لاکھ درہم قیاس کیجاتی تھی مشتمل تھا، ایک ہزار ایک سو ستاسی پارچے
اور ایک ہزار تین سو اسلحہ بھی اس مین شامل تھے، قدامہ کے بقول عبداللہ نے صرف تین
کروڑ اسی لاکھ درہم ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا، اور ملک کے محاصل کی مقدار چار کروڑ اسی لاکھ درہم
تھی، طبری راوی ہے کہ عبداللہ کے سالِ وفات ۲۳۰ھ ۸۴۴ء مین تمام مدات سے مجموعی
آمدنی اسی قدر ہوئی تھی،

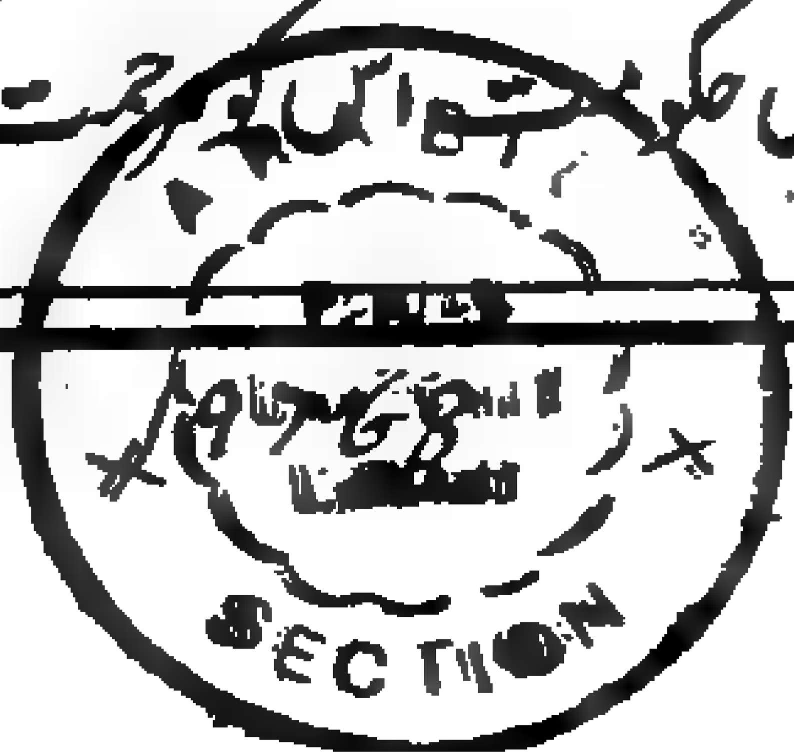
فی الجملہ طاہری رئیس عباسی خلافت کے خیرخواہ رہے، ۲۴۷ھ ۸۶۱ء مین ترکون نے
جب متوکل کو قتل کیا اور سلطنت کو یک لخت زوال شروع ہوا، اس وقت بھی طاہریون
نے خلافت کے ضعف سے کوئی قابلِ ذکر تمتع حاصل نہ کیا، ان کی اس سہل انگاری کے
تین سبب ہو سکتے ہین، اول یہ کہ طاہر کا خاندان جیسا ابھی مذکور ہوا شریکِ سلطنت کی حیثیت
رکھتا تھا، بہترین ممالک اُن کے زیرِ حکومت تھے، اور اندرونی انتظامات مین کوئی ان کا
دخیل نہ تھا، خاص خراسان کے علاوہ رَے اور کرمان، ان کی حکومت مین شامل تھے کرمان

کے شرق مین سرحد ہند تک کل علاقہ اُن ہی کے زیرنگین تھا، اسی طرح شمال کی جانب دربار
خلافت کی آخری حدود تک اُن ہی کی حکومت تھی، کفار سے لڑائیان ہوتین تو غنیمت
کا پانچوان حصہ ان کے لئے مقرر تھا، عراق سے نذر اور تحائف کے علاوہ ایک کروڑ تیس لاکھ
درہم انھین ملتے تھے، ولایت خراسان کے علاوہ اسی خاندان کا ایک فرد بغدادی عساکر
کا امیر تھا، اس منصب پر بلاشرکت غیرے قابض رہنے سے ان کا اقتدار ایک زمانہ مین
اتنا بڑھ گیا تھا کہ ۲۵۱ھ ۸۶۵ء مین جب کہ خلافت کی قسمت ترکون کے پنجے مین پہنچ گئی تھی
اسی خاندان کی بدولت خلیفہ کا وجود محفوظ رہا، محمد بن عبداللہ بن طاہر بغداد مین اتنا بااثر
تھا کہ خلفاء کا عزل و نصب اس کی مرضی پر منحصر ہو گیا تھا، مستعین اور معتز کی رقابت
مین خلافت کی قسمت جن لوگون نے فیصل کی تھی، ان مین محمد بن عبداللہ بھی شریک تھا،
الغرض طاہری امیر اور ترکی سردار دونون محل خلافت سے جبین بھرنے والی جماعتین تھین،
دوسرے صرف عبداللہ بن طاہر کے عہد مین یہ ممکن تھا کہ خود مختاری کی کوشش
کامیاب ہو سکتی، لیکن آثار انحطاط کے باوجود بھی خلافت اتنی ضعیف نہ تھی کہ یہ کوشش
بارآور ہونے کی توقع ہو سکتی، عبداللہ کافی ہوشمند تھا، اس نے خلیفہ سے رشتۂ اطاعت تو
منقطع نہ کیا مگر اپنے حدود کے اندر رہ کر بہتر سے بہتر فائدے حاصل کرتا رہا، یہ بھی ممکن ہے کہ
عبداللہ اور اس کے بیٹے نے خروج کر کے اہل دنیا کی نگاہ مین کافر ٹھہرنا پسند نہ کیا ہو، کیونکہ
یہ دونون سردار سچے مسلمان تھے،

تیسرا سبب یہ تھا کہ خلافت عباسیہ کا ناگہانی انحطاط اور طاہری خاندان کا زوال

بیک وقت وقوع مین آیا، ان کا آخری سردار محمد بن طاہر جو ۲۴۸ھ/۸۶۲ء مین باپ کی مسند پر بیٹھا کمسن اور عیش وعشرت کا دلدادہ تھا، ایسے کمزور حکمران کے زیرنگین خود اسی کے صوبے محفوظ نہ تھے، اسی عہد مین حسن بن زید (علوی) نے ۲۵۱ھ/۸۶۶ء مین طبرستان پر قبضہ کرکے خلیفہ مستعین سے عہد اطاعت شکست کر دیا، اور آخر ۲۵۹ھ/۸۷۳ء مین خود محمد طاہری کو یعقوب نے شکست دے کر گرفتار کر لیا، ان حالات مین دربار عباسیہ سے دوستی منقطع نہ کرنا خود طاہریون کے حق مین مفید تھا،

بالعموم مرکزی حکومت کے احکام سے طاہری رئیس روگردانی نہ کرتے تھے، بلکہ حتی الوسع نیک نیتی اور دیانت کے ساتھ بجاآوری کی کوشش کیجاتی تھی، ضرورت پیش آتی تھی تو دربار خلافت سے ان کو فوجی کمک بھی بھیجدی جاتی تھی، ۲۰۷ھ/۸۲۲ء مین جب طلحہ کو حکومت خراسان سپرد ہوئی تو اشروسنہ کا سردار کاؤس جو مامون کو خراج ادا کرنے کا وعدہ کر چکا تھا، باغی ہو گیا، چنانچہ احمد بن ابوخالد کو سپاہ لے کر سرکوبی کے لئے بغداد سے روانہ کیا گیا، طلحہ نے مرکزی حکومت کی اس امداد کو خوشی سے قبول کیا اور اس کی بدولت مقصد مین کامیاب ہوا، بعض اوقات یہ امیر خود ہی پیش قدمی کرتے اور ایسی شورشین فرو کر دیتے، ایک بار محمد بن القاسم خلافت کا جب مدعی ہوا تو عبداللہ بن طاہر نے اس مدعی کے خلاف کارروائی شروع کر دی، قاسم کو شکست دی اور ۲۱۹ھ/۸۳۴ء مین گرفتار کرکے خلیفہ معتصم کے حوالے کر دیا، اس عہد کا سب سے زیادہ عظیم فتنہ مازیار بن قارن کی بغاوت تھی، اور خلیفہ مامون نے طبرستان، رویان اور دماند کی حکومت اسی کو مرحمت کر دی تھی، مامون کی رحلت کے



بعد مازیار مین تمداد اور خروج کے آثار ظاہر ہونے لگے، عبداللہ بن طاہر نے اس کے مظالم بے دینی اور بداعمالی کی شکایت خلیفہ کو پہنچائین ۲۲۴ھ میں مازیار نے طاہریون کو خراج دینے سے انکار کیا اور علانیہ بغاوت شروع ہو گئی، خلیفہ کے سفیر نے فہمایش کی مگر مازیار نے ایک نہ سنی، اس اثنا مین بابک مزدکی اور دوسرے مجوسیون کو جنھون نے مسلمانون کے معبد مسمار کرا دیئے تھے، مازیار کی طرف سے بہت سے اعزاز عنایت ہوئے، مشہور افشین خراسان لینا چاہتا تھا، اس نے درپردہ اپنے رقیب عبداللہ بن طاہر کے خلاف مازیار کی ہمت افزائی کی، معتصم نے یہ سنتے ہی کہ مازیار خراج وصول کر رہا ہے اور اپنے حضور مین کورنش ادا کراتا ہے، عبداللہ کے نام فرمان لکھا کہ اس سے جنگ شروع کر دے، اور عبداللہ کی کمک کے لئے بغداد سے لشکر عظیم روانہ کر دیا، خلیفہ اور عبداللہ کی متحدہ جمعیت کا مقابلہ مازیار کی طاقت سے باہر تھا، وہ اسیر کر لیا گیا، اور خود عبداللہ نے بغداد لا کر خلیفہ کے حضور مین پیش کیا، جہان چار سو تازیانے کی سزا تجویز ہوئی، اس سزا سے مازیار جانبر نہ ہوا اور مرنے کے بعد اس کی نعش منظر عام پر رکھدی گئی،

طبرستان مین شیعان علی اور سیستان مین خارجی، خلافت کے دشمن تھے، اور ان مذہبی جماعتون کا فتنہ ہمیشہ طاہریون نے دبایا، خلفاے عباسیہ کے احکام بجا لانے اور ان کا ساتھ دینے مین طاہری اپنی اغراض پوری کرتے تھے، سنی المذہب ہونے کے سبب ان کے اور خلفا کے مفاد مشترک تھے، چنانچہ خلیفہ کے دشمن خود ان کے دشمن تھے یہ کوشش کہ ان کے ملک مین کوئی نیا مذہبی گروہ پیدا نہ ہو جائے ایک سیاسی ضرورت تھی

اسی طرح جدید علاقون کی تسخیر مین خلیفہ سے زیادہ خود ان کا فائدہ تھا، اس کے علاوہ طاہریون کو دربارِ خلافت سے وفاداری کا صلہ کافی ملتا تھا اور خلیفہ کی نگاہ مین ہمیشہ عزیز رہتے تھے، یہ طاہریون ہی کا اثر تھا کہ یعقوب صفاری مرتد اور باغی قرار دیا گیا، اور ۲۶۳ھ مین یعقوب کی قید سے محمد بن تاجور کے آزاد ہوتے ہی، خراسان، رے، فارس، قزوین، زرجان کی حکومت اور بغداد کی سپہ داری اس عیش پرست حاکم کو سپرد کی گئی، آخرالذکر عہدے پر بیشتر طاہری سردار ہی مامور ہوتے رہے،

خراسان مین طاہریون کی حکومت ان ہی اصول پر قائم رہی جو ۲۰۶ھ مین طاہر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو دیار ربیعہ کی حکومت سپرد ہوتے وقت تلقین کئے تھے، طاہریون کے طرزِ حکومت کا حال بہت کم معلوم ہے، مگر جو کچھ بھی معلوم ہو سکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ خود متشرع مسلمان تھے اور اصولِ شریعت ہی کے مطابق حکومت کرتے تھے،

آبپاشی کے متعلق کتب اسلامیہ مین کوئی مسائل موجود نہ تھے، چنانچہ جب اس مسئلہ پر اہالیانِ ملک کے باہم نزاع پیدا ہوئی تو عبداللہ نے فقہائے خراسان کو طلب کر کے ہدایت کی کہ بمشورۂ فقہائے عراق آبپاشی کے متعلق مسائل وضع کرین، اسی سلسلہ مین کتاب القُنیٰ کی تدوین کی گئی جو امورِ بالا کے متعلق عرصہ تک رہبری کرتی رہی، اس سے ظاہر ہے کہ طاہری پابندئ شریعت کی کوشش کرتے تھے، اور جہان کھلے ہوئے مسائل نہ ملتے تھے، اپنے فیصلے کو دخل نہ دیتے تھے، یعقوبی کا قول اگر صحیح ہے تو عبداللہ کے عدل، انصاف اور خوش انتظامی کا یہ حال تھا کہ اس سے پہلے خراسان کو ایسا حاکم نصیب ہی نہ ہوا تھا،

امیر وغریب سے قطع نظر اس کو فلاحِ خلق کی فکر بہت دامنگیر رہتی تھی، اس کو بالخصوص مزارعین سے ہمدردی تھی، اور اس نے مفت تعلیم ہر شخص کے لئے عام کردی تھی، وہ کہا کرتا تھا کہ علم تک ہر کس وناکس کی رسائی ہونی چاہئے، علم خود اپنی شرافت کی پاسبانی کرے گا اور نا اہل کے سینے مین نہ رہیگا، طاہر بن عبداللہ کو بھی متقی اور فیاض حاکم کہا جاتا ہے، حاجیون کے قافلون کو آسایش دنیا، طاہریون کا مخصوص شیوہ تھا،

حاصل کلام یہ ہے کہ طاہری امراسنی اور خلافت کے زبردست حامی تھے، وہ خلیفہ کو ہر کام مین مدد دیتے تھے، انھون نے خلافت کے دشمنون کی سرکوبی کی اور خلفاء کی مشکلات بڑی حد تک آسان کردین، وہ کفار سے جہاد کرتے تھے، حجاج کے قافلون کو آرام پہنچاتے تھے اور اپنے ممالک پر انصاف اور قابلیت کے ساتھ حکومت کرتے تھے، مامون اور اس کے جانشین ان کی نسبت بہترین رائے رکھتے تھے، اور وہ خلافت کے سب سے زیادہ سیر حاصل صوبے پر مامور رہے، خفیف تخالف سے قطع نظر، جو معاہدہ ان کے اور خلیفہ کے درمیان ہوا تھا اسی کے مطابق ان کا خراج مرکزی حکومت کو ادا ہوتا رہا،

یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت کا دنیوی اقتدار تاراج ہو رہا تھا، اس برے وقت مین انھون نے خلیفہ کی حمایت سے منہ نہ موڑا، اور ثابت کردیا کہ جو توقعات ان سے وابستہ تھین اور جو اعتماد ان پر کیا گیا تھا، اس کے اہل تھے، یہ سچ ہے کہ واقعات نے انھین خراسان کی ولایت پر نسلاً بعد نسلٍ قائم کردیا تھا، اور وہان سے ان کو تبدیل کرنا ناممکن

تھا، پھر بھی انھیں خلافت کی اطاعت سے آزاد یا نیم آزاد نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ تاریخ اسلام کے بعض مصنفین نے ثابت کرنا چاہا ہے۔ ایران میں خلافت سے سب سے پہلے جو منحرف ہوئے وہ صفاریہ تھے۔ اور اب خلفاء اور صفاریہ کے باہمی تعلقات پر ایک نظر ڈالنا چاہیئے۔



تیسرا باب

خلافت اور صفاریہ

طاہری خاندان کا آخری فرمانروا محمد بن طاہر (۲۴۸ھ - ۲۵۹ھ / ۸۶۲ء - ۸۷۳ء) خراسان کے علاوہ سجستان کا بھی حاکم تھا، اس نوجوان شاہزادے کو مہماتِ ملکی سے زیادہ اپنی تفریحات میں مصروفیت رہتی تھی، ترکون کے ظلم اور اختلافات نے بغداد کی مرکزی حکومت کو مفلوج کر رکھا تھا، خلافت کا سیاسی اثر نہ دارالسلطنت میں باقی تھا نہ ایرانی صوبون میں، چنانچہ خارجیون نے دست درازیان پھر شروع کر دین، اور محمد بن طاہر سے پہلے طاہریون کے عہد مین مخلوق کو جو امن اور سکون میسر تھا برباد ہو گیا، تفصیل کے ساتھ تو نہین معلوم کہ سجستان مین صورتِ حال کیا تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ خارجیون کی غارتگری سے لوگون کو محفوظ رکھنے کے لئے رضاکارون کی ایک جماعت قائم ہوئی تھی جو خود کو مطوّعہ کہتے تھے۔ ان کا سرگروہ درہم بن نصر بن صالح تھا، اس نے زرنگ پر قبضہ کر لیا اور سجستان سے طاہریون کے ناظم ابراہیم بن حسین کو نکال کر خود اس صوبے کا مالک بن بیٹھا، ان رضاکارون نے ایک قسم کی جمہوریت قائم کر لی تھی اور ان مین جو سب سے

زیادہ اہل اور قابل ہوتا تھا، سردار بنایا جاتا تھا، اس تنظیم کی بدولت جو واقعی صاحب جوہر ہوتے سامنے آجاتے،

اسی جماعت مطوعہ کا ایک رکن یعقوب تھا جو صفاری خاندان کا بانی ہوا، یعقوب ایک صفار یعنی ٹھٹھیرے کا لڑکا اور ولایت سجستان کے قصبۂ قرنین کا رہنے والا تھا، جو زرنگ کے قریب واقع ہے، جرأت، دلیری اور انتظامی قابلیت کی بدولت وہ جماعت کا سردار منتخب ہوا، اور انتخاب کے بعد ہی اس نے جوہر دکھانا شروع کر دیئے، اس کی کوششون نے قزاقون کی سرکوبی کی، آمد و رفت کے راستے محفوظ کر دیئے اور ایک ایک کو اس کا مداح بنا دیا، اپنے رفقا مین اس نے مساوات کا وہ اصول برتا کہ عسرت زدہ سجستانی اس کا دم بھرنے اور ایک ہموطن کے اس عروج پر ناز کرنے لگے، عباسی خلافت بھی اصولِ مساوات کی مدعی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ بنو عباس کا طرزِ عمل تمام مسلمانون کے ساتھ یکسان نہ تھا، بنو امیہ نے اہلِ عرب کو نوازا تھا، اسی طرح بنو عباس کی نگاہ کرم خراسانیون پر رہتی تھی، نہ عربون کی پرسش تھی نہ خراسانیون کے علاوہ فارس کی دوسری قومون کی، اس جانب داری کو گوارا نہین کیا جا سکتا تھا، لہذا ہم دیکھتے ہین کہ یہ نئی جماعت جو خارجیون کے خلاف پیدا ہوئی تھی رفتہ رفتہ طاہریون کی دشمن اور مآل کار خود خلافت عباسیہ کی معاند بن گئی، اور اس کا سبب یہ تھا کہ عباسی خلافت بے ہر فعل کی حمایت کرتی تھی

بنو عباس کے دور مین سجستان کو نہ مساوات نصیب تھی، نہ انصاف، چنانچہ یعقوب اور اس کے بھائی عمر کو عباسی خلفاء کے مقابل ہونے مین مذہبی پاس مانع نہ آیا، خلیفہ کی

وہ کتنی وقعت کرتے تھے، اس جواب سے ظاہر ہے جو یعقوب نے فتح خراسان کے وقت محمد بن طاہر کو دیا تھا، محمد بن طاہر نے جس وقت خلیفہ کی سند تقلید یعنی پروانہ حکومت طلب کیا تو یعقوب نے مصلے کے نیچے سے تلوار نکال کر طاہری سفیر سے کہا کہ میرے پاس یہ فرمان ہے اسی طرح عمر کو جب ماوراء النہر کی حکومت کا فرمان عطا ہوا تو اسی خیال کا اظہار ہوا خلیفہ کے سفیر نے فرمانِ خلافت جس وقت عمر کے سامنے سامنے پیش کیا تو اس نے پوچھا یہ کیا ہے، سفیر نے تشریح کی اور کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کی آپ نے خلیفہ سے خواہش کی تھی، عمر نے جواب دیا کہ میرے یہ کس کام آئے گا، اسمٰعیل سامانی سے ملک اگر لیا جاسکتا ہے تو صرف ایک لاکھ برہنہ شمشیروں سے، یہ سچ ہے کہ یعقوب اور عمر خلیفہ کو تمام مومنین کا سردار سمجھ کر اس کے حق مین دعا کراتے تھے اور ان ممالک کے سکون پر اس کا نام مضروب ہوتا تھا، مگر اس کے صرف یہ معنی تھے کہ وہ خلافت کو بہ حیثیت ایک مذہبی ادارے کے تسلیم کرتے تھے، بلکہ اتنا احترام بھی شاید مذہبی عقائد نہین بلکہ سیاسی مصلحت پر مبنی تھا، یہ وہ وقت تھا کہ خلیفہ کو خطا اور قصور سے بالاتر سمجھا جاتا تھا، اور شرعی حیثیت ہی سے نہین بلکہ فی الواقع وہ تمام عالمِ اسلامی کا امام تھا، ایک صوبہ دار کے لئے خلیفہ کا حریف بن کر حکومت قائم کرنا ان حالات مین دشوار تھا، پھر اس غاصب کے لئے تو اور بھی زیادہ مشکل تھا جس کے پاس بجز شمشیر کے اور کوئی وجہِ استحقاق نہ ہو، اس لئے اپنے مقاصد مین کامیاب ہونے کی خاطر صفاریون کو ضرورت تھی کہ خلیفہ سے برائے گفتن رشتہ قائم رکھین، ورنہ خطرہ تھا کہ اُن ہی کے محکوم جن کے سہارے پر وہ خلافت سے مقابل

ہو سکتے تھے، مخالف بنجاتے، فرمانِ خلافت کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ یعقوب کے بعد عمر کو علما، اور رضا کارن نے اسی وقت جائز حاکم تسلیم کیا جب کہ خلیفہ کا فرمان مل گیا نیشاپور مین ایک مرتبہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے عمر نے اپنے مسکن کے صحن مین تین روز تک وہ علم بلند رکھا، جو بغداد سے ارسال کیا گیا تھا، ان وجوہ سے صفاریہ مجبور تھے کہ جو ممالک دربار بغداد کے خلافِ مرضی فتح کئے تھے، ان پر حکومت کا حق حاصل کرنے کے لئے خلیفہ سے سمجھوتہ کرلین، چنانچہ خلافت کی طرف سے باغی اور غاصب ٹھہرنے اور رشتہ اطاعت بالاعلان شکست ہوجانے کے بعد بھی خطبے اور سکے مین خلیفہ کا نام بدستور قائم رکھنا پڑا،

یعقوب اور عمر دونون خلیفہ کا برائے نام اقتدار بھی پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ پہلا شخص جس نے خطبہ مین خلیفہ کے ساتھ اپنا نام شامل کیا، یعقوب تھا، عمر نے یہ ابتدا کی کہ طلائی سکہ پر خلیفہ کے ہمراہ اپنا نام بھی مسکوک کرا دیا،

ایشیا مین کسی صوبہ دار کا یہ عمل اعلانِ آزادی کے ہم معنی تھا، یہ امر محتاجِ ثبوت ہے کہ صفاری دربار بغداد کو باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے، اگرچہ ابن خلکان ناقل ہے کہ یعقوب نے اپنے زیرنگین ممالک کی دو تلث آمدنی خلیفہ کو نذر کرنے کا وعدہ کیا تھا، صفاری فرمانرواؤن کی ہوسناکی اور بے اعتدالی کب اجازت دیتی کہ جو کچھ مل چکا تھا اس پر قناعت کرتے، ایران ہی سے نہین بلکہ ممکن ہوتا تو وہ بغداد سے بھی خلیفہ کا تسلط ختم کر دیتے، سیاسی اختیارات خود حاصل کرکے خلیفہ کو برائے نام مذہبی پیشوا بنا دینے کا جو کام آل بویہ نے انجام دیا، اسی کی داغ بیل

صفاری ڈالنا چاہتے تھے۔

ان کے اصلی ارادے تو جو کچھ تھے وہ تھے لیکن بعض امور کے سبب وہ خلافت کے وفادار دوست اور اہلِ سنّت کے علمبردار متصور ہونے لگے، یعقوب اور عمر دونون نے کفارِ مشرق سے جہاد کئے اور گرانبہا تحائف خلیفہ کی نذر گزرانے، یعقوب نے مشرق کی جانب کوہستانی علاقے فتح کرکے اپنی ریاست وسیع کرلی اور افغانستان مین اشاعت اسلام کا باعث ہوا، مگر ان حروبِ مقدس کا مقصد توسیعِ سلطنت اور حصول غنیمت معلوم ہوتا ہے، خلیفہ کو تحائف ارسال کرنے مین غالبًا یہ مصلحت تھی کہ خلیفہ کو خوش رکھکر مفتوحہ علاقون کو زیر تصرف رکھنے کی سندِ جواز مل جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ عامۃ الناس کی نگاہون مین خادمِ دین وملت بننا مقصود ہو،

غالبًا اسی سیاسی مصلحت سے صفاریون نے علویون اور خارجیون سے محاربے کئے، یعقوب خود ابتداءً خارجی بتایا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہوچکا ہے، خارجیون سے ہی لڑکر اس نے شہرت حاصل کی، محمد بن طاہر کی شکست کے بعد جب کہ یعقوب خراسان کی حکومت کے لئے ساعی تھا، دربارِ خلافت کی وفاداری کے ثبوت مین اس نے اس خارجی سردار کا سر خلیفہ کی خدمت مین بھیجا تھا، اور یہ وہ سردار تھا جو نواحِ ہرات مین تیس سال سے خلیفۃ المومنین ہونے کا دعویٰ کررہا تھا، طبرستان کے حاکم حسن نے جب یعقوب کے حریف عبداللہ کو پناہ دی تو یعقوب نے جنگ کی اور حسن کو قتل کردیا، اس موقعہ پر اس نے نہایت مودبانہ الفاظ مین علویون کے خلاف

فتح پانے کا حال دربارِ خلافت کو لکھا اور خلیفہ کو اطلاع دی کہ اس وقت (۲۶۰ھ؁ ۸۷۳ء)
علوی خاندان کے ساٹھ افراد میری حراست مین ہین، اسی طرح رفیع نے جب خلیفہ
کے خلاف بغاوت کی اور طبرستان کے علوی شاہزادے سے ساز کر کے شیعہ مذہب
قبول کر لیا، اور جمعہ کے خطبہ مین علویون کا نام داخل کرا دیا تو عمر نے اس سے جنگ
کی، جہان قدم جمانا چاہے وہین تعاقب کیا، یہانتک کہ (۲۸۴ھ؁ ۸۹۷ء) مین سر کاٹ کر
خلیفہ کے حضور پیش کر دیا، ان دونون مواقع پر مقصود حقیقی خراسان کی حکومت حاصل
کرنا تھا،

عباسی خلافت سے صفاریون کا سرکشی کرنا عجم اور عرب کی جنگ نہین کہا جا سکتا
پارسی حکمرانون نے خلیفہ کے مقابل کوئی متحدہ بغاوت نہین کی، جو اس امر کا ثبوت ہے،
کہ عجمی قومیت کا برائے گفتن بھی وجود نہ تھا جیسا کہ مذکور ہوا، صفاری ہمیشہ دوسرے
عجمی فرمانرواؤن سے برسرِ پیکار رہتے تھے، اور بارہا خلیفہ کے دوش بدوش ان سے
معرکہ آرا ہوے، یعقوب مین عجمیت سے زیادہ اسلامیت کا جذبہ موجود تھا جس کی
بہترین شہادت یہ ہے کہ اس نے مشترکہ دشمن یعنی خلیفہ بغداد کے خلاف زنجیون کے
سردار سے اتحاد کرنا منظور نہ کیا، اس درخواست کے جواب مین اس نے کلام پاک
کی یہ آیت لکھدی کہ "کافرون سے کہدو کہ جس کو تم پوجتے ہو مین اس کی بندگی نہین کر سکتا"
یہ جواب یعقوب کی شریعت پرستی کا آئینہ ہے،

یہ بھی واقعہ نہین کہ صفاریون نے کسی ایسے حکمران کی تقلید کی جو عہدِ اسلام سے

† قل یا ایہا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد

پہلے گذرا تھا، باقاعدہ نظم ونسق وہ نہ قائم کرسکے، کیونکہ حکومت ہی ابھی متزلزل تھی، پھر بھی حکومت کی تنظیم مین جو اصول کام مین لائے گئے وہ اسلامی اصول سے تطابق رکھتے تھے نہ کہ قدیم ایرانی سیاست سے، صفاری سلاطین خود کو اپنے ادنیٰ سپاہیون کے مقابلہ مین بھی اعلیٰ اور برتر نہ تصور کرتے تھے، حکومت کے عمال کو تا حدِ امکان وہ خود ہدایات دیتے تھے، یعقوب سا وسیع المملکت سلطان بھی معمولی سپاہی کی سادہ زندگی بسر کرتا تھا، وہ اپنے خیمہ مین خدام اور ملازمین کے بغیر تنہا سوتا تھا، اس کی سپر تکیے اور بستر کی قائم مقام ہوتی تھی، دونون بھائی عمال کی خود نگرانی کرتے تھے اور خود مسندِ عدالت پر بیٹھتے تھے، تحصیلِ محاصل کے ضوابط ان کے ہان البتہ مقرر نہ تھے، ضروریات کے مطابق وہ قانون خود وضع کر لیتے تھے،

مختصر یہ کہ خلفائے بغداد کے ساتھ صفاریون کے تعلقات اتنے معاندانہ نہ تھے، جتنے معلوم ہوتے ہین، مذہبی حیثیت سے وہ خلیفہ کا احترام کرنے کے لئے تیار تھے لیکن حق اور انصاف کے اقتضا سے مجبور ہو کر خلیفہ اور صوبہ دارون کی کمزوری سے عاجز آکر انکو نئی حکومت کی بنیاد ڈالنی پڑی، مگر حدِ اعتدال سے گذر جانے کے سبب وہ اپنے خاندان کو مستقل فائدہ نہ پہنچا سکے،

بہرحال ایران مین اقتدارِ خلافت کے اولین منکر صفاری ہی تھے، انھون نے خلیفہ کی سیاسی قوت گھٹانے کا عزم کر لیا تھا، خلفاء کی خوش قسمتی سے جس عہد مین یہ سرکشی پیدا ہوئی بغداد کے تخت پر موفق اور معتضد متمکن تھے، اور ان خلفاء کے ہاتھ صفاریون کے

حوصلے شکست کرنے کے لئے کافی مضبوط تھے، خود صفاریون نے خارجی اور شیعہ جماعتون سے بیک وقت بگاڑ کر کے اپنی ہلاکت کا سامان مہیا کر لیا، دونون بھائیون نے شکستین کھائین اور مر گئے، ان کے ارادے ناکام رہے، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ماتحت حکمرانون کیلئے ذو امتیازاتِ خلافت جائز ہو گئے، یعنی خطبہ مین اور سکون پر ان کا بھی نام آنے لگا، اس کے علاوہ بغداد کو مستقل خراج دیئے بغیر حکومت کرنے کی مثال قائم ہو گئی، غرض ایران مین خلافت کی سیاسی قوت شکست کرنے کے لئے سب سے پہلا قدم جس نے اُٹھایا وہ یہی خاندان تھا، جو مراعات صفاریون نے بجبر حاصل کی تھین بعدہٗ سامانیون کے لئے خود خلیفہ کو اپنی طرف سے طوعاً یا کرہاً عنایت کرنا پڑین، اب آلِ سامان اور خلفاء کے تعلقات دیکھنا چاہئین،



چوتھا باب

خلافت اور سامانیہ کا پہلا دور

خلافت اور سامانیون کے تعلقات قدرتی طور پر دو حصون مین تقسیم ہو سکتے ہین، ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء سے جب کہ حکومت بغداد سے ان کو براہِ راست سابقہ پڑا، ۳۳۳ھ / ۹۴۴ء تک دورِ اول سمجھنا چاہیئے، دوسرے دور کی ابتدا ۳۳۳ھ / ۹۴۵ء سے ہوتی ہے، جب کہ خلافت پر آل بویہ کے اقتدار کا آغاز ہوا، اور ۳۸۹ھ / ۹۹۹ء مین جب کہ محمود غزنوی کے ہاتھ سے سامانی حکومت ختم ہوئی، دورِ ثانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، دورِ ثانی مین ان کے اور خلفاء کے باہمی معاملات کیا تھے، آیندہ باب مین مذکور ہون گے،

آلِ سامان ابتداءً خراسانی سلطنت کے ماتحت تھے، خلافت کے ساتھ ان کو پہلا واسطہ یعقوب کی فتحِ خراسان کے بعد پڑتا ہے، جب کہ ۲۶۱ھ / ۸۷۴ء مین خلیفہ معتمد کی طرف سے سامانی سلطنت کے بانی نصر کو ولایت ماوراء النہر کا جس پر وہ طاہریون کے عہد سے متصرف تھا، جائز حاکم تسلیم کیا جاتا ہے، خلیفہ اجازت دے دیتا ہے کہ ماوراء النہر مین خطبہ سے یعقوب

کا نام خارج کر کے نصر کا نام داخل کیا جائے، چنانچہ خلیفہ کے ساتھ والیِ ریاست کا نام خطبہ مین شامل کرنے کا حق جو یعقوب نے بزور حاصل کیا تھا، سامانی امیر کو خود خلیفہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے،

۲۷۹ھ/۸۹۲ء مین نصر کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد اس کا بھائی اسمٰعیل مسندِ حکومت پر بٹھایا گیا، اور ۲۸۷ھ/۹۰۰ء مین جب وہ عمر کو شکست دے چکا تو خراسان بھی جو وہ بزور شمشیر حاصل کر چکا تھا، ماوراء النہر کے علاوہ اس کے حدودِ حکومت مین داخل کر دیا گیا،

عمر کی شکست اور حکومت خراسان کی تفویض کے بعد سامانیون کی طرف سے خلافت کو باقاعدہ کوئی خراج پہنچنے کا ثبوت نہین ملتا، واقعہ یہ ہے کہ محمد بن طاہر کی شکست یعنی ۲۵۹ھ/۸۷۲ء کے بعد خراسان کی ولایت پر جتنے مامور ہوئے ان مین سے خلیفہ کو پابندی کے ساتھ خراج نہ کسی نے ادا کیا نہ کوئی ادا کرنا چاہتا تھا، بلکہ بعض حکام کے سرکشانہ رویہ کے سبب حکومتِ بغداد کو اکثر جنگ کے کثیر مصارف برداشت کرنے پڑے تھے، ان حالات مین خلیفہ کے لئے اس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی تھی کہ صوبہ خراسان ایک وفادار امیر کو سپرد کر دیا جائے اور شرائط وہی رہین جو سرکش امیرون سے طے ہوئے تھے، مشرق مین سونے کے سکہ پر کسی امیر کا نام مسکوک ہونا اعلانِ آزادی کے مترادف تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ ۲۹۵ھ/۹۰۷ء کو سامانی خودمختاری کا سالِ آغاز سمجھنا چاہئے، کیونکہ اس سن کے طلائی سکہ مین خلیفہ کے نام کے ساتھ امیر احمد بن اسمٰعیل سامانی کا نام مسکوک نظر آتا ہے، قطعی طور پر ثابت ہے کہ ۳۰۶ھ/۹۱۸ء مین سامانی خراج نہ دیتے تھے، کیونکہ مقتدر کے وزیر علی

ابن عیسیٰ کے لئے سنہ مذکور مین جو میزانیہ تیار کیا گیا تھا اس مین سامانی صوبون یعنی خراسان اور ماوراء النہر سے کوئی خراج درج نہین ہے، گویا اس وقت وہ تین حقوق جو صفاریون نے خلافت سے بہ جبر حاصل کئے تھے، سامانیون کو قطعی طور پر حاصل تھے، یعنی خطبہ اور سکہ مین ان کا نام شامل ہوتا تھا، اور ملک کے محاصل پر کلیۃً ان کا تصرف رہتا تھا، سامانی راسخ الاعتقاد سنّی تھے، انھین حکومت کے لئے خلافت کی سند درکار تھی، تاکہ حقِ سلطنت شرعی بنیاد پر قائم ہو جائے اور قانون فقہ کے مطابق احکامِ سیاست جاری ہوسکین، اس مذہبی ضرورت سے مجبور ہو کر خلیفہ سے فرمانِ امارت طلب کرنا پڑا، حالانکہ جن ممالک کے لئے یہ اجازت مطلوب تھی ان پر آلِ سامان بحقِ تسخیر قابض ہو چکے تھے، خلافت سے فرمان کی درخواست کرنا ماتحتی کا اعتراف کرنا تھا، اور فرمان دینے یا لینے والے کی موت پر اس کی تجدید ضروری تھی، اس حق کے سبب قانوناً حکومت خلیفہ کے ہاتھ مین رہی، اگرچہ حاکم واقعی سامانی تھے، اس کے برخلاف خلیفہ کو امیر کے انتخاب مین کچھ دخل نہ ہوتا تھا، یہ انتخاب سامانی حکومت ہی کا حق تھا، ہر تاجپوشی کے بعد جدید امیر فرمانِ خلافت کی درخواست کرتا تھا اور خلیفہ باقاعدہ فرمان عنایت کر دیتا تھا،

خلفاء کا سیاسی اقتدار روبہ زوال تھا، چنانچہ اس رسم مین تبریک اور تقدیس کا عنصر شامل کرنے کی غرض سے کبھی کبھی خلیفہ اپنے دستِ مبارک سے علم باندھ دیتا تھا، جہان تک ہمین معلوم ہے ایسے کسی فرمان کی نقل محفوظ نہین، اور یہ بہت افسوسناک

ہے، لیکن اس حلفِ وفاداری کی ایک نقل موجود ہے جو خلیفہ نے مسعود کو دیا تھا، اور اس کی عبارت سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہین کہ خلیفہ کا فرمانِ حکومت فرمانِ آزادی نہ ہوتا تھا تاکہ ماتحت امیر جس طرح چاہین فرمانروائی کرین، ان امیرون کو چند سیاسی اور مذہبی ذمہ داریان پوری کرنی ہوتی تھین، اور اپنے فرائض بجا طور پر انجام دینے کے لئے شدید حلف لینے ہوتے تھے، یہ سچ ہے کہ ان امیرون کو قول کا پابند رکھنے والی کوئی قوت موجود نہ تھی، مگر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقاً ان سے ایفاے عہد کی توقع ہوتی تھی، ہمعصر مصنفین کہین کنایۃً بھی اظہار نہین کرتے کہ خراسان کی رائے عامہ خلافت سے ترکِ تعلق کرنا گوارا کر سکتی تھی،

جہانتک داخلی نظم و نسق کا تعلق ہے، مرکزی حکومت سے سامانی قطعاً آزاد تھے، لیکن ہر بغاوت، ہر فتح اور ہر تحریک کی اطلاع دربار بغداد کو روانہ کیجاتی تھی، اور مفروض یہ تھا کہ ہدایاتِ خلافت کے مطابق سامانی امیر عملدرآمد کرے گا، مزید بران اس کو خلفا کی امداد مختلف طریقون سے کرنا ہوتی تھی، مثلاً مرتدین کی سرکوبی، جہاد مین شرکت اور حجاج کا اہتمام وغیرہ،

طاہر بن محمد بن عمر صفاری ۲۸۰ھ؁ ۹۰۱ء مین جب فارس مین داخل ہوا اور خلیفہ کے عامل کو ملک سے خارج کر دیا تو اسمٰعیل نے اس کو لکھا کہ صوبہ سیستان معہ مضافات کے مجھ کو خلیفہ نے عنایت کیا ہے اور اس لئے تم کو اس کی تسخیر سے احتراز کرنا چاہیئے، یہ خط دیکھ کر طاہر واپس ہو گیا، اور خلیفہ نے بدر نامی والی فارس مین مقرر کر دیا، ۲۹۶ھ؁ ۹۱۰ء مین

احمد اسمٰعیل نے ایک مراسلہ کے ذریعہ سے بغداد کو اطلاع دی کہ سیستان فتح ہوگیا اور محمد بن علی بن لیث جو خلافت سے باغی ہوگیا تھا گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد دوسرا مراسلہ پہنچا کہ سبکری جسنے دربار بغداد کے خلاف منشا فارس پر تصرف کر لیا تھا، اسیر کر لیا گیا خلیفہ کے حسب الحکم دونوں قیدی بغداد کو روانہ کر دیئے گئے اور خلیفہ نے سامانی سفیرون کو والی صوبہ کے لئے خلعت اور جواہرات کے تحائف دے کر واپس کیا، ۳۰۹ھ ۹۲۱ء مین خراسان کا ایک قاصد لیلی بن نعمان دیلمی کا سر بغداد لے کر بھیجا گیا، کیونکہ لیلی نے طبرستان مین خلیفہ کے خلاف سرکشی شروع کر دی تھی، اسی طرح ۳۳۰ھ ۹۴۱ء مین مکان بن کاکی کا سر بھی چند تحائف کے ساتھ بغداد کو روانہ کیا گیا،

سامانی امیر دربار خلافت کے تابعدار تھے کہ خود ان کے حقوق پر دست درازی ہوتی تو بھی خلیفہ کے مقابل نہ ہوتے، وہ ایسی کارروائیون کو معاندانہ نظر سے نہ دیکھتے تھے، اور خلیفہ سے صلح و آشتی کے ساتھ جتنا حاصل ہوسکتا تھا اسی پر اکتفا کرتے تھے، ۲۹۵ھ ۹۰۷ء مین اسمٰعیل کے انتقال کے بعد پرس کبیر جو دولت سامانیہ کی طرف سے صوبہ جات رے، طبرستان و جرجان پر مامور تھا جب تمام وصول کردہ محاصل لئے ہوئے بغداد پہنچا تو مقتدر نے اس کا خیر مقدم کیا اور دیار بکر کی حکومت تفویض فرمائی، مگر آل سامان نے خلیفہ سے درگذر کی، اسی طرح ۳۰۳ھ ۹۱۵ء مین محمد علی بن سلک جو حاکم خراسان کا قریب کے رشتہ سے بھائی ہوتا تھا، پناہ ڈھونڈتا ہوا بغداد پہنچا اور خلیفہ نے اس کو نہ صرف پناہ دی بلکہ خلعت سے سرفراز فرمایا،

۳۰۱ھ/۹۱۳ء مین نصر ثانی جب مسندِ حکومت پر پہنچا اور سیستان کے لوگون نے علمِ بغاوت بلند کر کے خلیفہ مقتدر کی اطاعت قبول کر لی تو خلیفہ نے صوبہ کی ولایت اپنے متوسلین کو سپرد کر دی، جھنون نے سامانیون کے حکام اور عاملون کو پا بہ زنجیر کر کے بغداد پہنچا دیا، پھر بھی سامانی امیرون نے اپنے شاہنشاہ کے خلاف کان نہ ہلایا، وہ سمجھتے تھے کہ اس قطعۂ ملک کو جو بالعوض خراج ہمارے تصرف مین ہے، خلیفہ جس کو چاہے منتقل کرنے کا مجاز ہے،

ضرورت پیش آتی تو سامانی کفار سے جہاد کرتے، ۲۹۱ھ/۹۰۳ء مین جبکہ ترکون نے ماوراء النہر پر یورش کی تو اسمٰعیل نے مسلمانون کو جہاد کے لئے آمادہ کیا، اور مجاہدین کی امداد سے ان کی قوت شکست کر دی، اس کا فتحنامہ بغداد روانہ کیا گیا،

سامانی سنّی مذہب کے پیرو تھے، اور اپنی قلمرو مین سنی جماعت کے خلاف جو تحریک اٹھتی اس کی مخالفت کرتے، ان کا سیاسی مفاد بھی اسی کا مقتضی تھا، ۲۸۹ھ/۹۰۱ء مین جبکہ طبرستان کے حاکم محمد بن زیاد نے جرجان پر حملہ کیا تو محمد بن ہارون نے جس کو اسمٰعیل نے سپاہ سالار بنا کر مامور کیا تھا، جرجان سے شیعانِ علی کو نکال دینے پر ہی بس نہ کیا، بلکہ خود طبرستان کو فتح کر کے سامانیون کے زیر نگین کر دیا، اور خلفاے بنو عباس کا نام خطبہ مین شامل کرا دیا، ۲۹۰ھ/۹۰۲ء مین محمد بن ہارون نے جس کو اسمٰعیل نے طبرستان کی حکومت سپرد کی تھی، اسمٰعیل اور خلیفہ دونون سے بغاوت کی، اور خلیفہ کے خلاف منشا رَے کے صوبے پر قبضہ کر لیا، خلیفہ کے حسب الحکم اسمٰعیل نے باغیون سے ملک کو پاک کر کے

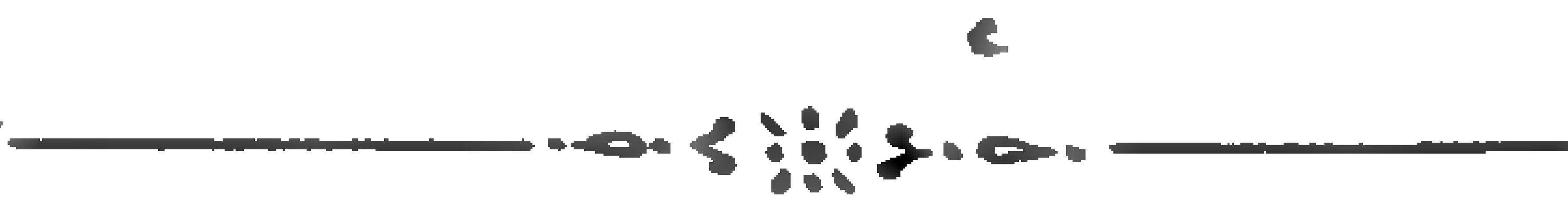
امن قائم کرنے کی کوشش کی، چنانچہ رَے پر قبضہ ہوگیا، اور ادائگی خراج کے وعدے پر خلیفہ نے رَے کا صوبہ بھی اسمٰعیل کو تفویض فرمادیا،

سامانی سرداروں مین کئی سردار قرمطی تحریک کے حامی بنگئے، آخر کار خود امیر نصر نے ان کی تلقین قبول کرلی، امیر کا یہ ارتداد علماء پر قدرتی طور پر شاق تھا، انھون نے ترکی سپاہیون سے امداد طلب کی، چنانچہ ترکی سپاہیون نے امیر کو قتل کرکے سپہ سالار مسندِ حکومت پر بٹھانے کا ارادہ کرلیا، سازش کا سراغ لگ گیا اور امیر کے بیٹے نوح نے سازشیون کے سرغنہ کو قتل کرادیا، مگر ساتھ ہی ساتھ نصر نے نوح کے حق مین جس پر بے دینی کا کوئی شبہہ نہین تھا، تخت سے دست برداری دے دی، نوح نے پہلے تو باپ کو پا بہ زنجیر کرنے کا حکم دیا اور بعدہٗ دیگر ملحدین کو کیفر کردار کو پہنچایا، ان کی جائدادین اور املاک حتیٰ کہ معزول امیر کے خزائن بھی صحیح العقیدہ مومنین کو منتقل کر دیئے گئے، آخر شیعہ جماعت کا خاتمہ ہوگیا، اور اس کا وجود محض مخفی گروہ کی حیثیت سے باقی رہگیا،

صفاریون کی طرح سامانی بہت زیادہ اولوالعزم نہ تھے، خلیفہ سے صلح و آشتی کے ساتھ جو مل جاتا اسی پر قناعت کرتے تھے، وہ چونکہ ایران کے سنی حکمرانون مین سب سے زیادہ صاحبِ قوت تھے، خلیفہ کے انتخاب مین بھی ان کا مشورہ طلب کیا جاتا تھا انھون نے اپنے وفادارانہ طرزِ عمل سے وہ اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ خلیفہ خطرے کے وقت ان کے علاقے کو اپنے لئے آخری مامن متصور کرتا تھا، جس وقت مقتدر قرمطیون کے ہاتھ تنگ تھا تو علی بن عیسیٰ نے خلیفہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اب کوئی واقعہ پیش آئے

توحضور خراسان کے بعید ترین حصّے مین چلے جائین،

خلفا، نے بھی سامانی وفاداری کا دل کھول کر صلہ دیا، بلاکسی تکلف کے مرکزی حکومت سے ان کو وہ مراعات عنایت ہو جاتی تھین جو دوسرون کے لئے ممنوع تھین، خلافت کو ان کی وفاداری پر اتنا بھروسہ تھا کہ جب کوئی صوبہ بغاوت پر کمربستہ نظر آتا تھا تو ہمیشہ اُن ہی کو سپرد کیا جاتا، وہ بھی اپنا فرض یون ادا کرتے کہ تمام فتنون کو دباتے، ملک مین امن قائم کردیتے اور پھر اگر حکم ہوتا تو زیر تصرف رکھتے ورنہ خلیفہ کو حوالے کردیتے، مختصر یہ ہے کہ اس دور مین بغداد کے خلفا، اور سامانی امیرون کے باہم کامل موافقت اور اتحاد نظر آتا ہے،



پانچواں باب

آل بویہ کے دور میں خلافت اور ایرانی فرمانرواؤں سے تعلقات

آل بویہ جب بغداد پر قابض ہو گئے تو تاریخِ خلافت کا نیا باب شروع ہوا، آل بویہ سے پہلے ہی وہ امرا جو دربارِ بغداد مین سربلند تھے، خلافت کو اختیاراتِ حکومت سے محروم کر چکے تھے، سکہ جو امتیازاتِ سلطانی مین داخل ہے، تنہا خلیفہ کے ساتھ منسوب نہ رہا تھا، وزیر کے بہت سے اختیارات امیر الامراء کے معتمد کو منتقل ہو چکے تھے، حتیٰ کہ ممالکِ محروسہ سے جو محاصل وصول ہوتے تھے، وہ بھی براہِ راست خلیفہ کو نہ پہنچتے تھے بلکہ ضروری اخراجات کے قابل ایک معینہ رقم خلیفہ کو دے دی جاتی تھی، مگر بایں ہمہ خلیفہ کو اب بھی ملتِ اسلامیہ کا دینی اور دنیوی پیشوا تصور کیا جاتا تھا، احکامات اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے، وزیر کا انتخاب اسی کی مرضی سے ہوتا تھا، اور وزیر کی ہستی ناقابلِ التفات نہ تھی، بالخصوص اس حالت مین کہ امیر الامراء کا منصب بہت سے امیدواروں کا مقصودِ نظر رہتا تھا،

مگر آل بویہ کو حکومت پہنچنے کے بعد حالات اور بھی ابتر ہو گئے، آل بویہ عباسیون کی خلافت کے منکر تھے، وہ ان کو غاصب تصور کرتے تھے، اور سبب یہ تھا کہ بویہی شیعی تھے[1] معزالدولہ کا خلافت کو تسلیم کرنا سیاسی مصالح پر مبنی تھا، ابتدا مین اس کا اقتدار محفوظ نہ تھا، بغداد پر بلا خونریزی کے قابض ہو جانے کے بعد اس کو اپنے حریف ہمدانیون سے مقابلہ کرنا پڑا، جو پہلے ہی سے امیرالامراء کے منصب پر فائز تھے، قریب تھا کہ فتح کا پلہ ہمدانیون کی طرف جھک جائے، مگر ۳۳۴ھ ۹۴۵ء مین محض ایک تدبیر نے معزالدولہ کو بغداد پر قابض رکھا، ہمدانیون کے علاوہ اس کو قرمطیون اور بریدیون سے بھی مقابل ہونا پڑا، معزالدولہ اس مخالفت سے بے خبر نہ تھا، چنانچہ اس کے نزدیک اہل بغداد کو جن مین سنیون کی کثرت تھی منحرف کر دینا مناسب نہ معلوم ہوا، شاید اس کا خیال تھا کہ تصرف حاصل کرنے کے بعد عباسی خلافت کی بجائے علوی خلافت قائم کیجائے جس وقت مستکفی کی طرف سے اپنے خلاف سازش کرنے کا شبہہ ہوا تھا تو اس نے مستکفی کو معزول کر کے خاندانِ علی کو خلافت منتقل کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، مگر ایک درباری کے مشورے نے اس ارادے کی تکمیل نہ ہونے دی، اس نے کہا کہ یہ خیال قرینِ عقل نہین، اس کے الفاظ یہ تھے "تمھارا گروہ عباسی خلیفہ کو اس منصب کا مستحق نہین سمجھتا، اگر خلیفہ اور تمھارے درمیان اختلاف ہوا اور تم خلیفہ کے قتل کا حکم دو تو بھی انھین تعمیل مین تامل نہ ہوگا، لیکن علوی خلیفہ ہوگا تو یہی جماعت اس کے حکم پر تمھین قتل کرنے سے بھی گریز نہ کرے گی" ان الفاظ کا معزالدولہ پر اتنا اثر ہوا کہ اپنی تجویز

[1] ابن اثیر ج ۸ ص ۳۳۹،

سے دستکش ہوگیا، اس کو ذاتی مصلحت کا پاس منظور تھا، سیاسی مفاد مذہبی جذبات پر غالب رہا اور قرعۂ فال پھر ایک عباسی خلیفہ مطیع کے نام پڑا، اس طرح عباسیون کی خلافت کو اس گروہ نے تسلیم کر لیا جو ان کے استحقاق کا قائل نہ تھا،

نظم و نسقِ خلافت آل بویہ کے ہاتھ مین آیا تو امرا کا ایک مستقل اور موروثی منصب قائم ہوگیا، خلیفہ کے پاس جتنا اختیار رہ گیا تھا وہ بھی چھن گیا، اس سے پہلے خلیفہ کی امداد کے لئے ایک وزیر رہتا تھا اور امیر الامراء کے پاس ایک معتمد، مگر اب صورت برعکس ہوگئی، وزیر کا تقرر خلیفہ کے اختیار مین نہ رہا، وزیر اور صوبہ دارون کے انتخاب مین امیر کا دخل اصولاً مسلّم ہوگیا، خلیفہ مستکفی کو پانچ ہزار درہم یومیہ بطور گذارہ دیئے جاتے تھے، مگر اس کے جانشین مطیع کے لئے یہ رقم صرف دو ہزار رہ گئی، اور وہ بھی امرا کے کرم پر منحصر تھی، اس کا ذاتی علاقہ جس سے دو لاکھ دینار سالانہ کی آمدنی تھی، ایک معتمد کو سپرد کر دیا گیا، مگر گذارہ کی رقم کی طرح یہ آمدنی بھی بویہی امرار کی مرضی کے تابع تھی، وہ چاہتے تو اس کو ضبط کر لیتے، کبھی کبھی جب کہ امرا مالی مشکلات مین گرفتار ہوتے تو خلیفہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا کہ صرف خاص سے کچھ رقم خزانے کو عنایت کرے، خلفا معزولی سے ڈرتے تھے اور ایسے مطالبون کو رد کرنے کی جرأت نہ رکھتے تھے

مختلف ولایات اور صوبہ جات مین جہان کے حکمران خلافت کی مذہبی حیثیت تسلیم کرتے تھے، اور عیدین کے خطبون مین خلیفہ کا نام پڑھتے تھے، اور جیسا کہ باب اول مین مذکور ہوا یہ اس امر کی علامت تھی کہ خودمختار اور آزاد فرمانروا بھی خلیفہ کو مذہبی

پیشوا مانتے تھے، لیکن بویہی دور سے پہلے بغداد کا خطبہ خلیفہ کے سیاسی اقتدار پر بھی دلالت کرتا تھا بویہی عہد میں یہ امتیاز بھی ختم کر دیا گیا، اور خلیفہ کے ساتھ امیر کا نام شامل ہونے لگا، عضد الدولہ اس بدعت کا بانی ہوا، بعدہ یہ رسم بویہی امرا کا مستقل شعار بن گئی، یہ صحیح ہے کہ اس رسم کا ترک واختیار زیادہ تر اہلِ قوم پر موقوف تھا نہ کہ امیر یا خلیفہ پر، لیکن عضد الدولہ کی چیرہ دستی اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے زیر تصرف علاقوں میں دو ماہ کامل تک خلیفہ طائع کا نام خطبے میں نہ آنے دیا، عموماً دستور تھا کہ بویہی امیر خلیفہ سے اپنا نام شامل ہونے کی درخواست کرتا تھا اور یہ درخواست اکثر منظور ہو جاتی تھی، خطبے میں نام شامل ہونا اس حقیقت کی سب سے بڑی علامت سمجھی جاتی تھی کہ خلیفہ نے امیر کو تسلیم کر لیا ہے، چنانچہ خلیفہ کے نام کے بعد امیروں کے نام جس ترتیب سے پڑھے جاتے تھے اس پر بھی خاص توجہ کیجاتی تھی، شرف الدولہ اور اس کے بھائی صمصام الدولہ کے درمیان جو صلح ہوئی اس کی ایک شرط یہ تھی کہ بغداد کے خطبے میں اول الذکر کا نام خلیفہ کے بعد اور صمصام الدولہ کے نام سے پہلے پڑھا جائے گا، خطبے سے اگر کسی امیر کا نام خارج ہو جاتا تو اس کے یہ معنی تھے کہ بغداد میں اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، جلال الدولہ کا نام بار بار خارج ہونا اور پھر شامل کیا جانا اس واقعہ کا ثبوت ہے،

ان تمام صوبوں میں جہاں بویہیوں کو حکومت حاصل تھی، خلیفہ کے ساتھ صرف بغداد کے امیر الامرا کا ہی نام شامل نہ ہوتا تھا، بلکہ بویہی خاندان کے دیگر امیروں کے

نام بھی پڑھے جاتے تھے، مگر دوسرے صوبون مین جو بویہی اثر سے آزاد تھے، بُویہی
امیرون کا خطبے مین ذکر نہ آتا تھا، بلکہ شرعی پیشوائی تسلیم کرنے کے لئے صرف خلیفہ کا ہی
نام پڑھا جاتا تھا،

سکون کے معاملے مین آل بویہ صرف خلیفہ کے سہیم و شریک ہی نہ تھے، بلکہ
اس امتیازِ خلافت کو اپنا اجارہ بنا چکے تھے، اور اس حد تک کہ خلیفہ کے نام کے بعد
"امیرالمومنین" کا لقب بھی متروک کر دیا گیا تھا، خلیفہ کا تو صرف نام سکّے کی پشت
پر مضروب ہوتا تھا، مگر امیر کے تمام خطابات اور کنیت بھی بغداد کے سکون پر نظر آتے
تھے، یہی نہین بلکہ بویہی خاندان کے سرخیل اور کبھی کبھی ولیعہد کا نام بھی مرقوم ہوتا تھا،
دارالضرب پر بویہیون کا براہِ راست تصرف تھا، اس لئے سکون پر ان کے نام
کے ساتھ ایسے خطابات بھی لکھدیئے جاتے تھے جو خلیفہ کی طرف سے کبھی نہ ملے تھے، یہ
واقعہ دلچسپی سے خالی نہین کہ بغداد کے بعض سکون پر "شاہنشاہ" کا خطاب بھی نظر آتا
ہے، حالانکہ جلال الدولہ سے پہلے یہ لقب کسی بویہی کو ملنا تاریخ سے ثابت نہین، او
اس قول کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب جلال نے ملک الملوک کے لقب
کی درخواست کی تھی تو ایک نزاعی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا اور نتیجہ یہ ہوا تھا کہ اس لقب کے
جواز و عدم جواز کا فیصلہ کرنے کے لئے قاضیون کی عدالت ترتیب دی گئی تھی سکون
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عنانِ اختیار کبھی امیر کے ہاتھ سے نکل کر خلیفہ کو ملتی
تھی اور کبھی خلیفہ سے امیر کو، طاقتور امیرون کے دور مین خلیفہ کا نام پشت پر سکوک

نظر آتا ہے، اور کمزور امرا کے عہد میں رہ سکے پر، بویہی طاقت کو زوال ہو گیا تو خلیفہ قادر نے بغداد کے مضروبہ سکوں پر اپنے بیٹے کا نام بھی لکھوا دیا[1]،

شانِ خلافت کا ایک اور امتیاز نوبت اور نقارہ تھا جو خلیفہ کی ڈیوڑھی پر نماز کے اوقات پر بجتا تھا، عضد الدولہ نے اس خصوصیت پر بھی چھاپہ مارا، اور خلیفہ کو مجبور کر کے اپنی ڈیوڑھی پر فجر، مغرب اور عشا کے وقت تین مرتبہ نوبت بجنے کا حکم صادر کرا لیا، اس کے بعد ڈیوڑھی پر نوبت اور نقارہ رکھنا بویہی امیر دن کا معمول ہو گیا، سلطان الدولہ اور جلال الدولہ نے تین مرتبہ کی بجائے پانچ وقت نقارہ نوازی شروع کرا دی اور خلیفہ کا احتجاج کچھ کام نہ آیا،

آلِ بویہ حکومت کے بھوکے ضرور تھے پھر بھی خلیفہ کی قانونی حیثیت برقرار رکھنا قرینِ مصلحت سمجھتے تھے، چنانچہ خلافت اور امارت کے ہر تغیر پر سند عطا ہونے کی رسم بحالہ قائم رہی، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ کارروائی محض رسمی ہوتی تھی، کامیاب حریف کو سند عنایت کرنے پر خلیفہ مجبور رہتا تھا، تاہم اس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی، اہلِ ملک کو مطمئن کرنے کے لئے اس رسم کا ادا کرنا ناگزیر تھا، ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جب کہ کسی بویہی امیر نے خلیفہ سے سند کی استدعا نہ کی ہو، بالعموم ایک باضابطہ مجلس منعقد کی جاتی تھی، جس میں اعیانِ سلطنت، اکابر دربار، سردارانِ عسکر، قاضی اور فقیہ جمع ہوتے تھے، فرمانِ خلافت پانے والا بڑی متانت اور عاجزی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا، خلیفہ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیتا تھا اور برسم تعظیم خلعت کو سر پر

[1] LANE POLE, COINS OF MUHAMMADAN DYNASTIES P. 219

رکھ لیتا تھا، اس کے بعد فرمان کی عبارت بہ آواز بلند پڑھی جاتی تھی، خلیفہ اور امیر باہم حلف لیتے تھے، اول الذکر دوستی کا عہد کرتا تھا، تو دوسرا وفاداری کی قسم کھاتا تھا، عوام کی نظر مین اس سند کی وہ اہمیت تھی کہ اس زمانہ مین بغیر اس اجازت کے کسی امیر کے لئے مستقل حکومت قائم کرنا ناممکن تھا، غاصبون اور رقیب مدعیون کا فیصلہ اسی کی بنا پر ہوتا تھا، مگر آل بویہ کے دور مین ہر چیز حکران امیر پر منحصر تھی، اس کی منشا کے خلاف خلیفہ کوئی پروانۂ حکومت عطا نہ کرسکتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ بہت سے حاکم اور غاصب خلیفہ کی بجائے بویہی امیر سے رجوع کرتے تھے، اور بعض اوقات خلیفہ کو بادلِ ناخواستہ فرمان عنایت کرنا پڑتا تھا، لیکن امیر الامراء یا کوئی طاقتور بویہی چاہتا تو اس سند کو ردی کاغذ بنا سکتا تھا، جب کہ بختیار کو فخر الدولہ سے مصالحت کی تمنا تھی، تاکہ عضد الدولہ کے خلاف فخر الدولہ کی مدد لی سکے تو اس نے خلیفہ طائع سے دو فرمان حاصل کئے، ایک خود اپنے حق مین اور دوسرا اپنے سردار سہلان بن مسافر کے نام، ان فرامین کے رو سے بختیار اور سہلان عضد الدولہ کے نائبین کی حیثیت سے نہین بلکہ براہِ راست خلیفہ کے صوبہ دارون کی حیثیت سے اپنے علاقے کے حاکم قرار دیدیئے گئے، سہلان کو عصمۃ الدولہ کا خطاب بھی عنایت ہوا، اور نام مین کنیت کا اضافہ ہوگیا، مگر عضد الدولہ کے خوف سے بختیار اور سہلان اتنی جرأت نہ کرسکے کہ خلعت زیب تن کرلیتے نہ سہلان نے کبھی خطاب نام کے ساتھ الحاق کیا،

خلیفہ کا ایک اور اختیار خصوصی اعزاز و مناصب کی بخشش تھا، یہی ایک چیز رہ گئی تھی جس سے خلفا کسی امیر کی خوشنودی حاصل کرسکتے تھے، خلیفہ سے بلند آہنگ خطابات

کی تقسیم مین محتاط تھا، ہر فرد کے لئے مناسب خطاب کی تجویز مین بڑی جدت طرازیان دکھائی جاتی تھین، خلیفہ کی طرف سے کسی امیر کا نام مع کنیت کے مرقوم ہونا بھی ایک عزت تھی، اور بعض اوقات بلند مرتبہ سردار اس عزت کے لئے مصر نظر آتے تھے، اس باب مین بھی بویہی امرا کا اثر خلفا پر اتنا تھا کہ بڑے بڑے بلند خطاب جو ان کی اہلیت سے کہین بالاتر تھے حاصل کر لیتے تھے، اس کے برعکس سامانی امرا کو جو ہمعصر امیرون مین سب سے زیادہ خلافت کے وفادار تھے خلیفہ ایک خطاب بھی نہ دے سکا، حالانکہ شاید ان کو نوازنا وہ دل سے چاہتا ہوگا، دستور یہ تھا کہ خطاب کی استدعا براہ راست خلیفہ سے نہین بلکہ بویہی امیر کی خدمت مین پیش کیجاتی تھی، اور بویہی امیر مطلوبہ خطابات اپنے محبوب اشخاص کے لئے حاصل کرلیتا تھا، اس کے ساتھ ہی ساتھ آل بویہ نے ایک نیا دستور یہ بھی شروع کر دیا تھا کہ خلیفہ کے دیئے ہوئے خطابات کو ناکافی سمجھ کر اپنے لئے خود خطاب تجویز کر لیتے تھے،

سیاسی مصلحتون کی بنا پر آل بویہ بہت سے اہم احکامات خلیفہ کے نام اور اس کی مہر سے جاری کراتے تھے، اور یہ مہر خود خلیفہ کے قبضہ مین رہتی تھی، مختلف صوبون کے حاکمین سے جو مراسلت ہوتی تھی اس پر بھی خلیفہ کے دستخط ضروری تھے، اسی طرح تشخیص مال گذاری کے سلسلہ مین عمال جو پٹے لکھتے تھے ان پر بھی خلیفہ دستخط کرتا تھا، لیکن یہ کارروائی صرف ضوابط کی رسمی خانہ پری معلوم ہوتی ہے، امیر اپنے حسب منشا جو انتظام چاہتا کرتا تھا اور کاغذات خلیفہ کے دستخط کے لئے بھیج دیتا تھا،

آلِ بویہ چونکہ شیعہ تھے، انھیں عباسی خلفا کا احترام مدنظر نہ رہتا تھا یہی سبب تھا کہ انھون نے خلفا کے ساتھ ایسا ذلیل برتاؤ روا رکھا، ان ہی کے عہد مین یہ واقعہ دیکھنے مین آتا ہے کہ بعض تقریبات مین خلیفہ بنفسِ نفیس امیر سے ملنے جاتا تھا، اسی دور مین خلیفہ منتخب کرنے کی رسمی کارروائی بھی متروک ہوگئی، آلِ بویہ خاندانِ شاہی مین سے جس کو چاہتے خلیفہ نامزد کر دیتے تھے، اور جب چاہتے اس کو تاج و تخت سے محروم کر سکتے تھے،

آلِ بویہ کے دور مین خلیفہ کی جو حیثیت تھی اسکی بہترین مظہر خلیفہ مطیع (۳۳۴ھ ۹۴۶ء ۳۶۳ھ ۹۷۴ء) کی تقریر ہے، بختیار نے مطیع سے درخواست کی تھی کہ جہاد کے مصارف کیلئے جیب خاص سے کچھ امداد فرمایئے اس کا مطیع نے جو جواب دیا وہ یہ ہے: "حکومت میرے ہاتھ مین ہوتی، مال اور لشکر پر میرا اختیار ہوتا تو جہاد بھی مجھ پر فرض تھا، اب تو کیفیت یہ ہے کہ میرا حصہ بس ایک معمولی روزینہ ہے اور وہ بھی ضروریات کے لئے ناکافی، سلطنت کے مالک تم ہو یا صوبون کے حاکم، جہاد، حج، یا کسی کاروبارِ حکومت سے مجھے واسطہ نہین، میرے پاس کچھ رہ گیا ہے تو صرف یہ نام جو تمھاری مساجد مین تمھاری رعایا کو مطمئن رکھنے کے لئے خطبون مین دہرایا جاتا ہے اگر تم اس حق کو بھی چھیننا چاہتے ہو، تو مین اس کے لئے بھی حاضر ہون اور ہر چیز تمھارے لئے چھوڑ سکتا ہون"۔

کوئی شک نہین کہ یہ الفاظ انتہائی عالمِ یاس مین ایک ناروا مطالبہ سے مفر حاصل کرنے کے لئے لکھے گئے تھے، مگر ان سے ظاہر ہے کہ خلیفہ اپنے خاندانِ دولت کا کس قدر محکوم تھا، تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خلفا کی تنگدستی اس حد تک پہنچ گئی تھی، یہی خلیفہ جو حج اور جہاد

کے لئے اپنی دولت کا کوئی جزو علحدہ کرنا نہ چاہتا تھا، تین محل تعمیر کراتا ہے، جن کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ مابعد صدی مین قطع کے یہ تین محل اور "تاج" نامی قدیم محلسرا کے کھنڈر جن کے نواح مین یہ قصر بنائے گئے تھے، شرقی بغداد کے ایک ثلث رقبہ پر مشتمل بتائے جاتے تھے،

یہ صحیح ہے کہ خلافت بغداد ایک ناچیز حقیقت رہ گئی تھی اور خلفاء کے یہ شیعی آقا ان کی اہمیت قطعاً نظر انداز کرتے تھے، لیکن سنی جماعت کے سرتاج ہونے کی حیثیت سے خلیفہ کو وہ وقار حاصل تھا کہ خود بویہی اپنی بہنین اور بیٹیان نذر کرنا فخر سمجھتے تھے، حالانکہ اس قرابت کا بدلہ انہین خاندانِ خلافت کی طرف سے کبھی نصیب نہ ہوا، پیشوائے اہل سنت ہونے کی حیثیت سے بہت سے خود اختیار سنی سلاطین کے وفود ان کی خدمت مین حاضر ہوتے تھے، خلیفہ سے خلعت اور سند حکومت حاصل کرتے تھے اور مختلف مواقع پر گرانبہا نذرین پیش کرتے تھے، اسی حیثیت سے زائرین مکہ سے سفر یا واپسی کے وقت خلیفہ خطاب کرتا تھا، خود بویہی امراء عوام کے قلوب پر خلیفہ کی شان وشوکت کا نقش بٹھانا مناسب سمجھتے تھے اور خاص خاص مواقع پر بڑے تزک واحتشام کی نمائش کرتے تھے، مسلم فرمانرواؤن کی نگاہ مین خلیفہ کا وقار قائم رکھنے کے لئے ان سے یہ اصرار کرنا کہ اپنے ممالک مین خطبے اور سکے مین خلیفہ کے نام کو جگہ دے کر اعتراف اطاعت کرین، بویہی امرا اپنا فرض جانتے تھے،

داد وانصاف کے علاوہ قاضی کے فرائض مین یہ بھی داخل تھا کہ ایسے شاہدون کی

فہرست مرتب رکھیں، جن کی ثقاہت مسلمہ ہو، اس فہرست کی ترتیب مین قضاۃ بڑے اہتمام سے کام لیتے تھے، ہر ششماہی کے بعد جدید اضافے کئے جاتے تھے، اور نامناسب نام خارج کر دیئے جاتے تھے، ان ثقات مین سے ایک تعداد ایسی منتخب کیجاتی تھی جو قضاۃ کی امداد کے لئے مامور ہوتی تھی، ان معاونین کا تقرر قاضی کرتا تھا اور جب قاضی برطرف یا ملازمت سے دستکش ہوتا تو اس کے مقرر کئے ہوئے نائبین بھی اپنے عہدون سے علیحدہ ہو جاتے، نائبین کے انتخاب مین قضاۃ اہل سیاست کا اثر نہ قبول کرتے تھے، اس کے ثبوت مین یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ عضد الدولہ کے میرلشکر نے عضد الدولہ سے ایک مرتبہ خواہش کی کہ ایک خاص شخص کا نام فہرستِ ثقات مین شامل کرنے کے لئے قاضی کو ہدایت کردی جائے، مگر عضدالدولہ نے جواب دیا کہ کسی سپاہی کی سفارش کرنا چاہو تو کرو، ثقات کی فہرست بنانا قاضی کا کام ہے جس مین نہ مجھے دخل ہے نہ تمھین، صرف خلیفہ بحیثیت امام شرعی کے حق رکھتا تھا کہ مشتبہ اشخاص کو فہرست سے خارج کرا دے، تاہم بعض اوقات جبکہ قاضی پر حکمران امیر اثر ڈالتا تھا تو قاضی کو خطرات کا سامنا ہوتا تھا، اور ایسی صورت مین اکثر باہمی تصفیہ سے اختلاف کا خاتمہ کیا جاتا تھا،

مساجد کے امام براہ راست خلیفہ کے ماتحت تھے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، یہ سچ ہے کہ بویہی امیر جب چاہتے احکامِ خلافت کی تعمیل نہ ہونے دیتے، لیکن بالعموم عوام کی ناخوشی کا خوف ان کو مداخلت سے باز رکھتا تھا، مساجد کے امامون کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ خطبہ مین کوئی بدعت راہ نہ پاسکے، ۴۲۰ھ ۱۰۲۹ء مین کرخ کے شیعی

اصحاب نے خطبہ مین کچھ ترمیم کر دی تو خلیفہ نے ایک خطیب مقرر کر دیا، اوّل تو اس خطیب کو پتھر مارے گئے اور نماز روک دی گئی، مگر بعدہٗ سرغنہ اصحاب نے معافی چاہی اور بدستور سابق خلیفہ کے نام کے ساتھ خطبہ پڑھنے کی اجازت طلب کی، چنانچہ اجازت دیدی گئی،

مذہبی امور ہنوز خلیفہ کے اختیار مین تھے، اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ خلیفہ قائم ۴۲۶ھ ۱۰۳۴ء جب جلال الدولہ سے خفا تھا تو جلال کے ہوش درست کرنے کیلئے اس نے قاضیون، فقیہون، امامون اور نکاح خوانون کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ اپنے اپنے کار منصبی سے باز رہین،

یہ دورِ انحطاط تھا جب کہ علی بن محمد الماوردی نے (۳۸۱ھ ۹۹۱ء تا ۴۵۰ھ ۱۰۵۸ء) جو سرتاج فقہائے اسلام مین شمار ہوتا ہے منصبِ خلافت کی شرعی اور قانونی حیثیت کو باقاعدہ تشریح کے ساتھ نمایان کیا، اس مسئلہ کی اشاعت سے جو واقعات اور عمل سے اس درجہ بین اختلاف رکھتا تھا مصنف کا مقصود شاید یہ ہو کہ اس وقت آلِ بویہ کے علاوہ جو شیعہ ہونے کے سبب خلیفہ کا چندان احترام نہ کرتے تھے، خود مختار سنی حکمران بھی سیاسی ضروریات کی بنا پر خلفائے بغداد کی ہستی نظر انداز کرنے لگے تھے، ان حالات مین اندیشہ تھا کہ منصبِ خلافت ہی نابود نہ ہو جائے، سنی والیانِ ملک کے باہم ایک مشترک پیشوا کی اطاعت سے گو وہ اطاعت برائے گفتن ہی باقی رہ گئی تھی، رشتۂ اتحاد قائم تھا، اس وقت خطرہ تھا کہ یہ رشتہ شکست ہو کر ملتِ اسلامیہ مین اتحاد کی نمود بھی مٹ جائے گی، ممکن ہے کہ ماوردی نے سیاساتِ اسلامیہ پر یہ تصنیف خلیفہ کی تحریک سے شروع کی ہو تا کہ

بویہی امراسنی رعایا اور آزاد مسلم تاجداروں کو معلوم ہو جائے کہ باوجود اس ضعف کے جو اس وقت خلافت پر طاری ہے، خلیفہ کی اہمیت اور اس منصب کی ضرورت کیا ہے مگر اغلب یہ ہے کہ خلافت کی انتہائی بے بسی ہی اس تالیف کی محرک ہوئی ہوگی اور مقصود یہ ہوگا کہ مسلم قوم کی اہلسنت جماعت کو جتا دیا جائے کہ خلافتِ اسلامیہ محض سیاسی واقعات کا اتفاقی نتیجہ تھی جس کے متعلق سمجھ لیا جائے کہ زندگی کے دن پورے کر چکی بلکہ اس کے برخلاف خلافت خدا کے قائم کئے ہوئے شعائر اور ملتِ اسلامیہ کے ضروری ارکان میں داخل تھی یہ سمجھنا کہ ماوردی جیسے ذی ہوش مصنف نے یہ رسالہ محض عقائد کے خیالی میدان میں مشق قلم کرنے کے لئے لکھا ہو قرینِ عقل نہیں ہو سکتا، چنانچہ مصنف دکھاتا ہے کہ خلافت کو کیا ہونا چاہئے۔ وہ خلیفہ کی اس ناتوان اور حقیر حالت کا جو بویہی امیروں کی محکومی میں نظر آتی تھی ذکر نہیں کرتا لیکن تمام سنی فقہا کی طرح وہ اس الزام کے خلاف کہ سنی جماعت گمراہی میں پڑی ہوئی تھی، ضرور استدلال کرتا ہے لہذا مجبوراً اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ بہت سے ایسے افعال کو جو کسی حد تک اسلامی مطمحِ نظر سے متصادم ہوتے تھے، شرعاً جائز قرار دے، چنانچہ حالاتِ گردوپیش کو دیکھتے ہوئے وہ دنیوی حکمرانوں کا ایک طبقہ قائم کرتا ہے، اور اس طبقے کا نام امرا مستولی رکھتا ہے، اس صنف میں بویہ اور غزنویہ جیسے آزاد فرمانروا داخل سمجھے جا سکتے ہیں لیکن وہ اس گروہ کا دائرہ محدود کر دیتا ہے، اور اصولِ شریعت سے تطابق پیدا کرنے کے لئے چند شرائط قرار دیتا ہے، جن کے پورے ہونے کے بعد ایسے حکمرانوں کا ادعائے سلطانی

جائز تصور کیا جا سکتا ہے،

ماوردی کے بقول وہ امیر ہے جو خلیفہ کی اجازت اور اطلاع کے بغیر بزور شمشیر کسی حصۂ ملک پر تسلط حاصل کر لیتا ہے، اور خلیفہ حصولِ حکومت سے باز نہ رکھ سکنے کے باعث ان مقبوضات کا تمام نظم و نسق اس کو سپرد کر دیتا ہے، ماوردی کہتا ہے کہ اس صورت مین امیر مذکور مستقل حاکم سمجھا جائے گا، لیکن خلیفہ یا امام مذہبی قیادت کے سبب امور شرعی اور احکامِ دینی کا مصدر اور سرچشمہ رہے گا اور اس صورت سے ایک غیر شرعی اور ناجائز امارت، جائز اور حدودِ شرع مین داخل ہو جائے گی، اس قسم کے غاصب کو حکومت تفویض ہونے سے قبل مصنف کے نزدیک سات شرائط کی پابندی ضروری ہے،

۱- ملتِ اسلامیہ کے مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے خلیفہ کا جو احترام واجب ہے اس کو امیر مذکور ملحوظ رکھے،

۲- جہان تک امور مذہبی کا تعلق ہے وہ بالاعلان خلیفہ کی اطاعت قبول کرے تاکہ اختلاف کا گمان کبھی نہ ہو سکے،

۳- خلیفہ کے ساتھ دوستی اور مرافقت کے تعلقات رکھے اور اغیار کی نگاہ مین اسلام کی عزت قائم رکھنے کے لئے ملتِ اسلامیہ کے مشترک مقاصد مین خلیفہ کی اعانت کرے

۴- مذہبی حقوق کی حفاظت کرے اور کوشش کرے کہ ان حقوق کے متعلق احکام اور فتوی پس پشت نہ ڈال دیئے جائین،

۵- ملک کے محاصل آئینِ شریعت کے مطابق وصول کرے، اور اس باب مین عدل و

انصاف سے کام لے،

۶۔ اس امر کی نگرانی کرے کہ حدود سیاست دیانتداری کے ساتھ جاری کیجاتی ہین،

۷۔ اسلام کی حفاظت اور حمایت فرض سمجھے اور ممنوعات سے پرہیز کرے، اگر دیکھے کہ رعایا احکامِ مذہبی کی پابند ہے تو اس کے دینی حقوق مین مداخلت نہ کرے، اور اگر لوگ مذہب کی طرف سے لاپرواہون تو اسلام کی طرف دعوت دے،

پیشتر مذکور ہو چکا ہے کہ آل بویہ شیعہ ہونے کے باعث خلافتِ عباسیہ کا مذہبی تقدس نہ تسلیم کرتے تھے نہ اس کا احترام ملحوظ رکھتے تھے، چنانچہ وہ فرائض جن کا تعلق خالص مذہبیت سے تھا، انھون نے کبھی پورے نہ کئے، بہ ظاہر وہ مسندِ خلافت کی عزت کرتے تھے اور لوگون کی نگاہ مین اس کا احترام قائم رکھنے کے لئے ساعی رہتے تھے، مگر یہ طرزِ عمل سیاسی مصلحتون پر مبنی تھا، ان کے بعض افعال نے خلافت کو اور بھی زیادہ حقیر کر دیا، جو بغداد کے اہلِ سنت کو ناگوار گذرا،

جس وقت معزالدولہ نے بغداد مین تسلط قائم کر لیا، تو اس نے شیعہ جماعت کو جس کی تعداد بہت قلیل تھی، ابھارنا شروع کر دیا اور سنیون کے کثیر التعداد فرقہ کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا، حکومت کی ہمت افزائی سے شیعہ اتنے جری ہو گئے تھے کہ ۳۵۱ھ ۹۶۲ء مین انھون نے اہلسنت کی مساجد اور مکانات پر بخطِ جلی یہ عبارت لکھدی "معاویہ بن ابی سفیان پر جس نے خلافت کو غصب کیا، اور ان لوگون پر جنھون نے فاطمہؓ سے فدک چھین لیا، اور ان لوگون پر جنھون نے حسنؓ کو نانا کے پہلو مین دفن نہ ہونے دیا، اور اُن

لوگون پر جنھون نے ابوذر غفاری کو جلاوطن کیا، اوران لوگون پر جنھون نے ابن عباس کو مجلسِ شوریٰ سے نکال دیا، خدا کی لعنت ہو"

جب معلوم ہوا کہ رات مین یہ عبارت مٹادی گئی ہے تو معزالدولہ کو مشورہ دیا گیا کہ ان تحریرون کی بجائے یہ الفاظ کہ "اہلِ بیتِ رسولِ خدا کے ساتھ جنھون نے ظلم کیا ان پر خدا کی لعنت ہو" لکھا دیئے جائین اور اس عبارت مین بجز معاویہ کے کسی کا نام ظاہر نہ کیا جائے،

اگلے سال ۳۵۲ھ؁ ۹۶۳ء مین معزالدولہ نے عاشورہ محرم منانے کی بنا ڈالی، اس روز تمام دوکانات اور بازار بند رکھنے کا حکم دیا گیا، لوگون کو غمِ شہادت مین پشمینے کے پیرہن پہننے کی ہدایت ہوئی، اور عورتون کو مجبور کیا گیا کہ بال بکھیرے چہرے سیاہ کئے اور ماتم حسین مین سر پیٹتی ہوئی شہر اور مضافاتِ شہر کا گشت لگائین شیعی جماعت کا دوسرا اہم تیوہار عید غدیر بھی بڑی مسرت اور نشاط کے ساتھ منائی گئی، سرکاری عمارتین چراغان کی گئین اور رات بھر بازار کھلے رہے، خلیفہ ان بدعتون کو جو سنیون کے جذبات مجروح کرتی تھین روک نہ سکا، کیونکہ معزالدولہ کشتیِ حکومت کا ناخدا تھا، اہلسنت دل ہی دل مین کڑھتے رہے اور شیعہ جماعت یہ مراسم ادا کرتی رہی،

خلیفہ کے مذہبی فرائض مین سب سے زیادہ اہم جہاد اور حج کا انتظام تھا، مگر بویہی دور مین یہ خدمات بھی فراموش کردی گئی تھین، خلیفہ تو یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا تھا کہ یہ فرائض ان پر عائد ہوتے ہین جنھون نے سلطنت کے نظم و نسق کی ذمہ داری

لی ہے، دوسری طرف آلِ بویہ ان امور کی طرف اعتنا نہ کرتے تھے، کیونکہ وہ شیعہ تھے اوران خدمات کو سرانجام دینے مین بجز صرف کے ان کو کسی ذاتی منفعت کی امید نہ ہو سکتی تھی،

عدم ذمہ داری کے اس عہد مین بالخصوص جب کہ حمدانی ایک طرف تو رومیون اور دوسری طرف آلِ بویہ سے دست وگریبان رہتے تھے، رومیون کو مسلم مقبوضات پر یورشین کرنے اور مسلمانون کے جان ومال کو کثیر نقصان پہنچانے کا موقعہ ملا، بجز خلیفہ اورآل بویہ کے اُن کے مظالم سنکر ہر مسلمان کا دل تڑپ جاتا تھا، ۳۶۱ھ ۹۷۲ء مین جبکہ رومیون نے نصیبین پر حملہ کیا اور شہر پر قابض ہوگئے تو ساری بستی کو نذرِ آتش کردیا، مردون کو تہ تیغ کیا اور بچون کو قید کرلیا، اس وقت دیارِ ربیعہ اور دیارِ بکر سے بہت سے مسلمان بغداد پہنچے اور مسجدون اور بازارون مین کھڑے ہو کر مسلمانون کو تلوار اٹھانے کی دعوت دی، اس مرتبہ ضرور بغداد کے کچھ مسلمان ان کے شریک ہوگئے، سب مل کر خلیفہ مطیع کے محل تک پہنچے اور کھڑکیان توڑ کر حضورِ خلافت مین باریابی حاصل کی، انھون نے گستاخانہ الفاظ مین اس سے کہا کہ امام کے ذمہ خدا نے جو فرائض رکھے ہین ان کو انجام دینے کی تم اہلیت نہین رکھتے، بغداد کے چند سربرآوردہ لوگ بختیار کے پاس بھی پہنچے، بختیار اس وقت بہ ظاہر تو شہدا کی زیارات کے لئے، مگر دراصل شکار کھیلنے باہر گیا ہوا تھا، اس وفد نے بختیار سے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے،

"تم مسلمانون کے مفاد کی پروا نہین کرتے، اور بجائے اس کے کہ رومیون سے جنگ

جنگ کرنے مین اپنی کوششین صرف کرو، عمران سے لڑکر قوت رائگان کر رہے ہو، حالانکہ عمران اہل قبلہ سے ہے، بختیار نے وعدہ کیا کہ مین واپسی پر عمران سے مصالحت کرونگا اور سرحد پر پہنچ جاؤن گا، جب واسط آگیا تو اس نے ابو تغلب والی موصل کو احکام روانہ کئے کہ اس کے لشکر کے لئے رسد اور چارہ کافی مقدار مین مہیا رکھے، کیونکہ وہ رومیون پر حملہ کرنے کا قصد رکھتا تھا، ایک دوسرا حکم سبکتگین وزیر بغداد کو بدین مضمون روانہ کیا گیا کہ جہاد مین شرکت کرے، سبکتگین کی نمایشی دعوت پر بغداد نے غیر معمولی جوش کے ساتھ لبیک کہا، مگر اس کو کوچ کرنا کب مقصود تھا، اس سپاہ کو اپنے محفوظ لشکر کے طور پر اس نے بغداد ہی مین رکھنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جمعیت موجب صد پریشانی ہوگئی، بے کاری مین باہم جھگڑنا شروع کر دیا، ایک دوسرے کا گلا کاٹتا تھا، مال لوٹتا تھا، اور عورتون کی عصمت دری کی جاتی تھی، معاملات نے نازک صورت اختیار کرلی اور جہاد کی بجائے جس کی خاطر یہ لوگ اکھٹا کئے گئے تھے، انھون نے بغداد ہی کو تاراج کرنا شروع کر دیا، یہ ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ اس موقع پر جہاد کے حیلے سے بختیار نے خلیفہ مطیع سے چار لاکھ درہم وصول کئے،

ان حالات مین اگر حجاج کے قافلے بے خطر سفر نہ کر سکتے تھے تو کیا تعجب ہے، اس باب مین سلاطین بویہ اور خلیفہ کی بے التفاتی کا یہ حال تھا کہ ایک کردستانی سردار بدر بن حسنویہ خراسان کے قافلہ کے ہمراہ پانچہزار دینار تحفظ راہ کے مصارف کے لئے بھیجتا تھا، بعدہ اس نے یہ رقم نوہزار کردی، اور آخر اس کی تعداد بیس ہزار سالانہ تک پہنچ گئی، ۴۰۵ھ (۱۰۱۴ء) مین جب اس سردار کا انتقال ہوگیا تو یہ امداد بند ہوگئی جس سے زائرین کو سخت تکلیف پہنچی،

اور حجاج کے قافلے سفر نہ کر سکے،

شاہانِ بویہ نے اختیارات پر تو قبضہ کر لیا تھا، مگر اختیارات سے متعلق جو فرائض اور ذمہ داریان تھین، ان سے قطعی آزاد تھے، خلیفہ ان کا محکوم ہو گیا تھا اور اس محکومی کی بدولت ان آزادسی حکمرانون کے ساتھ جو آلِ بویہ کے رقیب تھے، خلیفہ کے تعلقات ناخوشگوار ہو گئے تھے، مثلاً اس زمرہ مین آلِ سامان کا نام لیا جا سکتا ہے، چنانچہ اب ہم دیکھنا چاہتے ہین کہ سامانیون کا رویہ خلیفہ کے ساتھ کیا رہا،

یہ تو ظاہر ہے کہ بغداد مین آلِ بویہ تسلط قائم ہونے کے بعد سامانیون اور خلفاء کے باہم وہ لطف نہ رہ سکتا تھا جو پہلے تھا، سامانی شاہانِ بویہ کے مدمقابل تھے اور سمجھتے تھے کہ رے، جبال طبرستان، اور نیز خراسان کی بدولت آلِ بویہ سے مستقل برسرپیکار رہنا پڑیگا وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ خلیفہ شاہانِ بویہ کے ہاتھ مین گڑیا کی طرح بے بس ہے، اور ان کے مقاصد کی تکمیل کا آلہ بنجائے گا، لہذا خلیفہ کے وہ احکام جن سے سامانیون کی سیاسی قوت کو صدمہ پہنچتا قابلِ تعمیل نہ ہو سکتے تھے، اس صورت مین خلیفہ کو خراج یا تحائف نذر دینا شاہانِ بویہ کا خزانہ معمور کرنے کی ہم معنی تھا، اور یہ دولت خود سامانیون کے خلاف استعمال کیجاتی، با این ہمہ سامانیون نے مطیع کو خلیفہ تسلیم کرنے مین تامل نہ کیا، حالانکہ آلِ بویہ نے مطیع کے پیشرو مستکفی کو اس موقع پر معزول کیا تھا، جب کہ خراسانی سفیر کے خیر مقدم کے لئے دربار منعقد ہو رہا تھا اور یہ معزولی بڑی تذلیل کے ساتھ عمل مین لائی گئی تھی سامانی چاہتے تو خلیفہ اور خود اپنے سفیر کی اس تحقیر کو بہانہ بنا لیتے اور مطیع کو جائز امام نہ

تسلیم کرتے، کیونکہ وہ خلیفۂ سابق کے خلاف سازش کرکے بو بہیون کا مورد الطاف اور مسند
خلافت کا مالک بنا تھا، لیکن سامانی ابھی وقت کے منتظر تھے، ابھی ان کا سیاسی مفاد
معرضِ خطر میں تھا، دو سال تک وہ مطیع کی خلافت تسلیم کرتے رہے، مگر اس کے بعد
انھوں نے سرخم کرنے سے انکار کر دیا، یک لخت یوں ترکِ تعلق کرنے کا اصل سبب کیا
تھا اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن تاریخی شہادت دستیاب نہیں ہوتی، اغلب یہ ہے کہ خراسانی
سپہ سالار ابو علی بن محتاج کی بغاوت سامانی آزادی کا سبب ہوئی، شاہانِ بویہ اور نوح
سامانی کا چچا ابراہیم جو موصل میں ناصر الدولہ ہمدانی کی فوج میں ملازم تھا، ابو علی کو بھڑکا رہے
تھے، ۳۳۴ھ؁ ۹۴۵ء میں ابو علی نے ابراہیم بن احمد کو خراسان آنے کی دعوت دی، اور یہ اطلاع
بھیجی کہ ابراہیم حاکم مقرر ہو چکا ہے، اور بو علی کے ساتھی اس کی اطاعت قبول کرنے کو تیار
ہیں، ناصر الدولہ بھی ابراہیم کی حمایت کر رہا تھا، چنانچہ اس نے ابراہیم کو خلعت سے سرفراز کیا
اور خلیفہ مطیع کا قائم مقام نیکر علم کا پھریرا اپنے ہاتھ سے باندھا، رکن الدولہ کے مقابلہ میں ابو علی
کو رے خالی کر دینا پڑا، ۳۳۵ھ؁ ۹۴۶ء میں جبال پر بھی رکن الدولہ قابض ہو گیا، مگر اسی سال متفقین
کی متحدہ سپاہ نے نوح کو شکست دی، ابو علی اور ابراہیم بخارا میں داخل ہوئے، اجناس اور
نقود پر قبضہ کر لیا اور ابراہیم کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا، ابو علی نے اس فتح کا مژدہ
عماد الدولہ کو ارسال کیا، اور درخواست کی کہ خلیفہ سے ولایت خراسان کا فرمان ابراہیم
کے نام حاصل کرے، غالباً ان ہی فرامین کی اہمیت شکست کرنے کے لئے اس وقت
نوح نے فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ کی اطاعت سے انکار کرنا چاہئے اور پورے نو سال تک

وہ اس انکار پر قائم رہا،

سامانی جو پکے سنی تھے، اس وقت عجب کشمکش مین گرفتار تھے، خلافت اہلسنت کا مذہبی ادارہ تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبون مین خلیفہ کا نام لینا، سکون پر اس کا نام مضروب کرانا اور یون اس کی امامت تسلیم کرنا مذہبًا ضروری تھا، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ ہر امیر کی موت پر نئے جانشین کے حق مین خلیفہ کا فرمان حاصل کر کے اس کی حکومت کو جواز کی سند دی جائے، چونکہ نوح بن نصر کو یہ سند خلیفہ مستکفی سے حاصل ہوئی تھی، اس لئے مطیع کی خلافت سے جس کو بویہیون نے تخت نشین کیا تھا، انکار کرنے کا بہانہ موجود تھا مگر خطبے اور سکے مین نام شامل ہونے کا فریضہ شرعی بھی پورا کرنا تھا، اس کی خاطر نوح نے ایک جدید حیلہ تلاش کر لیا، یعنی خطبے مین اور سکون پر سابق خلیفہ کا نام جاری رکھا، لیکن ۳۳۸ھ/۹۴۹ء مین جب کہ بینائی سے معذور خلیفہ معزول کی وفات ہو گئی تو نوح کا یہ عمل بالکل مہمل ہو گیا، پھر بھی ۳۴۴ھ/۹۵۵ء تک سامانیون کا معمول وہی رہا، یہ پہلا موقعہ تھا کہ سیاسی ضرورت نے ان والیان ملک کو ایسا طریقہ ایجاد کرنے پر مجبور کر دیا جس سے خلیفہ کے احکام سے سرتابی بھی کر سکین، اور ساتھ ہی ساتھ خطبے مین اور سکے پر مرحوم خلیفہ کا نام قائم رکھ کر اہل ملک کے مذہبی احساسات کو بھی مشتعل نہ ہونے دین، گویا ان کو اس شرعی منصب کی ضرورت تو تسلیم تھی لیکن پس پردہ ریشہ دوانیان کرنے والون کی شیطانی چالون کو ٹھکرانا چاہتے تھے، یہی مثال جس کو سامانیون نے قائم کیا تھا، ذرا بدلے ہوئے رنگ مین مغلون نے اس وقت اختیار کی جب کہ وہ دائرۂ اسلام مین داخل اور ایسی تدابیر کے محتاج ہو گئے تھے،

۳۳۶ھ / ۹۴۷ء سے لے کر ۳۴۴ھ / ۹۵۵ء تک کا زمانہ جب کہ سامانی خلافت سے باغی رہتے سامانیون اور رکن الدولہ کی سیاسی رقابت کا مرقع ہے، رکن الدولہ چاہتا تھا کہ جس قدر وسیع ممکن ہو ایک خود مختار حکومت قائم کر لے ۳۲۳ھ / ۹۳۴ء مین مرداویج کے انتقال کرنے پر اور بعد ازان ۳۲۹ھ / ۹۴۰ء مین ماکان کے مرنے پر مختلف مدعیانِ حکومت کے باہم مجادلہ شروع ہو گیا تھا، ان مین رکن الدولہ اور سامانیون کا مخصوص حصہ تھا اور یہ دونون فریق اپنے سیاسی اغراض کی خاطر ایک دوسرے کے حریفون کو شہ دیتے رہتے تھے، قدرتی طور پر سامانیون نے مطیع کی خلافت تسلیم نہین کی، کیونکہ اس عہد مین ان کے خلاف بہت سے احکامات مطیع سے جاری کرائے گئے، نوبت یہانتک پہنچی کہ ۳۳۷ھ / ۹۴۸ء مین رکن الدولہ نے اپنے بھائی معز الدولہ سے درخواست کی کہ حکومت خراسان کا فرمان اس کے حق مین حاصل کر لے اور معز الدولہ اس مین کامیاب بھی ہو گیا، رکن الدولہ خلیفہ کا عطا کیا ہوا خلعت پہن کر برآمد ہوا تاکہ عوام کو اپنے جائز حق کا یقین دلا سکے، مفتیانِ شرع، سرداران سپاہ اور دیگر عمائدین کے روبرو وہ فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس مین حکومت خراسان اسکو تفویض کر دیگئی تھی، اس کے بعد جب نوح بن نصر سامانی نے ۳۴۳ھ / ۹۵۴ء مین ابو علی ابن محتاج کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا تو اس نے حکومت خراسان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا، رکن الدولہ سے امداد چاہی اور فرمانِ خلافت دلا دینے کی درخواست کی، معز الدولہ نے ابو علی کے سفیر کا خیر مقدم بڑے تپاک کے ساتھ کیا، اس کو مطیع کی خدمت مین باریاب کرایا اور ابن نصر کی بجائے حکومتِ خراسان بوعلی کے نام تفویض کرا دی، اس نے

ابو علی کی امداد کے لئے ابو منصور لشکر ورازکو روانہ کیا جس نے ۳۴۳ھ (۹۵۴ء) مین نیشاپور پہنچکر خطبہ مین امیر خراسان کی بجائے خلیفہ مطیع کا نام داخل کرادیا، مگر عوام کے قلوب پر اس تغیر کا کچھ اثر نہ ہوا، وہ جانتے تھے کہ خلیفہ کی پستی کس درجہ تک پہنچ چکی ہے، اور وہ کس طرح آل بویہ کا آلۂ کار بنا ہوا ہے، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ سامانی امیر جنھون نے خلیفہ کی اطاعت ترک کردی تھی، حکومت کا جائز حق رکھتے تھے، ان حالات مین خلیفہ کی حکم عدولی کرنے مین سامانی بھی تامل نہ کرتے تھے، عبدالملک جو نوح کے بعد امارت پر سرفراز ہوا، نیشاپور پر حملہ آور ہوا، اور ابو علی کو نکال کر خود قابض ہوگیا، ابو علی فرار ہوکر رکن الدولہ کے پاس پہنچا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد وہ اور اس کا بیٹا دونون راہیٔ عدم ہوگئے، اگلے سال خراسانی لشکر نے رے پر دھاوا کیا اور اصفہان لے لیا، اس فتح نے سامانی سپہ سالار کی ہمت اتنی بڑھادی کہ اس نے رکن الدولہ کے بیٹے کا تعاقب کیا اور اس کا سامان لوٹ لیا، البتہ ابن العمید کی ہوشیاری اور جرأت کی بدولت جو رکن الدولہ کا وزیر تھا کامل بربادی سے بچ گئے،

مگر خراسان کا نیا امیر عبدالملک باوجود امیر واقعی ہونے کے کسی عباسی خلیفہ کا اجازت یافتہ نہ تھا، لہذا وہ چاہتا تھا کہ رکن الدولہ سے مصالحت ہوجائے تاکہ فرمان خلافت حاصل کرلیا جائے، بغیر اس کے قضاۃ اور دیگر مذہبی عمال کا تقرر جائز نہ سمجھا جاتا، اس وقت فرمان خلافت حاصل کرنا فریضۂ شرعی ہی نہین بلکہ سیاسی ضرورت تھا، اس عہد مین بھی یہ حکمران خلیفہ کے فرمان کو کتنا اہم سمجھتے تھے، اس کا اندازہ اس جواب سے

ہو سکتا ہے جو ناصر الدولہ حمدانی نے نوح کے چچا ابراہیم بن احمد کو دیا تھا، ابراہیم ناصر الدولہ کی سرکار مین ملازم تھا، جب ۳۳۴ھ ۹۴۵ء مین نوح کو معزول کرنے کے لئے ابو علی نے ابراہیم کو دعوت دی اور ابراہیم نے اپنے آقا ناصر الدولہ سے اجازت چاہی تو ناصر الدولہ نے جواب دیا کہ "ہم عنقریب بغداد جانے والے ہین، اتنا انتظار کرو کہ ہم وہان پہنچ جائین تاکہ خلیفہ سے تمہین فرمان، خلعت اور علم دلا دیا جائے، اس سے تمہاری عزت اور قوت دونون المضاعف ہو جائین گی،

۳۴۴ھ ۹۵۵ء مین عبد الملک نے رکن الدولہ سے اس شرط پر صلح کر لی کہ رکن الدولہ رے اور جبال پر قابض رہے، اور اس کے معاوضہ مین امیر خراسان کو کچھ رقم دیدی جائے اس کے بعد عبد الملک نے اپنے بھانجے کو رکن الدولہ کے سفیر کے ہمراہ بغداد روانہ کیا اور خلیفہ مطیع سے حکومت خراسان کا فرمان عنایت کرنے کی درخواست کی، خلیفہ نے عبد الملک کے لئے علم اور خلعت فاخرہ ایلچی کو عنایت کیا، اور علم کا پھریرا اپنے دست مبارک سے باندھا خلعت امیری کے علاوہ ایک گھوڑا اور ایک ملبوس اور مرحمت ہوا جو اس اعزاز کی نشانی تھا، کہ اس کا پانے والا خاصۂ شاہی کی شرکت سے سرفراز کیا گیا،

آل بویہ اور سامانیون کے تعلقات ایک مرتبہ پھر ٹوٹے اور ہمیشہ کے لئے ٹوٹے، قادر کی خلافت جس کو بویہیون نے تخت نشین کیا تھا، سامانیون نے تسلیم نہین کی، اسکا سبب خلیفہ طائع کی معزولی تھی جو ۳۸۱ھ ۹۹۱ء مین بغیر کسی قصور کے محض اس لئے عمل مین آئی کہ بہاء الدولہ طمع کے جوش مین خلیفہ کی مفروضہ دولت پر قابض ہونا چاہتا تھا،

سامانی سابق کی طرح خلیفہ معزول کا خطبہ پڑھتے رہے، اور جیسا کہ سکون سے ظاہر ہے اسی کا نام مضروب ہوتا رہا، خلیفہ قادر کی کوشش بھی بے سود رہی، اس نے ۳۸۳ھ ۹۹۳ء مین حجاج کے قافلون کے سامنے تقریر کی اور خراسانی زائرین نے امیر کے نام خطوط اور پیغام لے جانے کا وعدہ کیا، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا،

مذکورۂ بالا دو واقعات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سامانی عباسی خلافت کو کس حد تک تسلیم کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ خلافت کے ساتھ ان کے رشتہ ہاے اتحاد روز بروز شکست ہوتے جاتے تھے، آخری دو امیر یعنی منصور (۳۸۷ھ ۹۹۷ء تا ۳۸۹ھ ۹۹۹ء) اور عبدالملک جو چند ماہ حکمران رہے شرعی حق حاصل کئے بغیر حکومت کرتے رہے، لیکن معزول عباسی خلفا کا خطبہ پڑھنا اور سکون پر ان کے نام مسکوک کرتے رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ عباسی خلافت کے خیر خواہ تھے، منصبِ خلافت کے ساتھ سامانیون کی دلی عقیدت اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ اپنے عہدِ حکومت مین اس کو تسلیم کرنے ہی پر انھون نے قناعت نہ کی بلکہ اس امر کے ساعی رہتے تھے، کہ بویہی بھی خلافت سے سرتابی نہ کرین ۳۷۳ھ ۹۸۳ء مین موید الدولہ کے مرنے پر جب فخر الدولہ نے اس کی جگہ لی تو اس کے وزیر ابن سدن نے کوشش کی کہ صمصام الدولہ سے صلح کرا دے، منجملہ دیگر امور کے اس نے فخر الدولہ کو یہ بھی لکھا کہ خراسان سے ایک ایلچی پیغامِ صلح لے کر آیا ہے، جس کی شرطِ اول خلیفہ کی اطاعت ہے (جو ایک مذہبی فریضہ بھی ہے اور دنیوی کامیابی کا وسیلہ بھی)

سامانیون کو خلیفہ کا احترام بہت ملحوظ رہتا تھا، یہی سبب تھا کہ انھون نے بویہیون

کی طرح بلند آہنگ اور پُر نخوت القاب اختیار کرنے سے احتراز کیا، یوہی اس باب مین یہ بھی پروا نہ کرتے تھے کہ خطاب خلیفہ نے عطا بھی کیا ہے یا نہین، اس کے برعکس سامانی "ولی امیرالمومنین" کے لقب پر قانع رہے اور یہ خطاب خود خلیفہ نے دیا تھا، یہ سچ ہے کہ وہ اپنے ماتحتون کو بڑے بڑے پرشوکت خطاب عنایت کر دیتے تھے، لیکن ان خطابون کو وہ وقعت حاصل نہ تھی جو عطیۂ خلافت کے ساتھ مخصوص تھی، خلیفہ کے دیئے ہوئے خطاب کس احترام کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ ابو علی سنجری نے سامانی امیر سے مصالحت کے لئے جو شرائط پیش کی تھین ان مین ایک یہ بھی تھی کہ خلیفہ سے ابو علی کو بھی وہی خطاب دلایا جائے جو سامانیون کو دیا گیا تھا، حالانکہ اس کو نوح سامانی سے "امیرالامراء منصور من اللہ" کا عظیم المرتبت خطاب مل چکا تھا،

ان شرائط کے بموجب جو فرمان خلافت مین درج ہوتی تھین، دوسرے سنی امیرون کی طرح سامانی بھی اپنے ممالک پر حسب احکام شریعت حکومت کرنے کے پابند تھے، اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کے نظم و نسق کا نقشہ وہی تھا جو خود خلیفہ کی قلمرو مین نظر آتا تھا شروع ہی سے سامانی امیر کے تقرر مین خلیفہ کو اس سے زیادہ دخل نہ تھا کہ جب امیر تخت پر بیٹھ جاتا تو خلیفہ فرمان کے ذریعہ سے اپنی اجازت کا اعلان کر دیتا، امارت نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی تھی بعض خلفاء کی طرح سامانی بھی اپنے جانشین نامزد کر دیتے تھے، اور کبھی کبھی دو یا تین نامزدگیاں علی الترتیب کیجاتی تھین، اگر نامزد شدہ کوئی وارث

موجود نہ ہوتا تو عمائدین دربار اور پیشوایانِ مذہب خاندان کے افراد مین سے کسی ایک کو منتخب کر لیتے، خلیفہ کی طرح سامانی امیر کے انتخاب کے بعد بھی منتخب کرنے والے وفاداری کا حلف لیتے اور اس کے بعد عام لوگون سے بیعت لیجاتی، انتخابی آئین وہی تھے جو خلفاء کے لئے ضروری تھے، صرف اتنا فرق تھا کہ سامانی مسند پر نابالغ بھی متمکن ہوسکتا تھا،

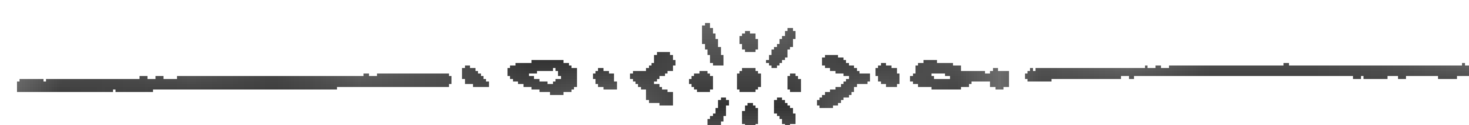
اگرچہ سامانی حکومت کی ابتدا مطلق العنانی سے ہوئی تھی، لیکن ان کا طرزِ فرمانروائی مطلق العنانی سے بہت دور تھا، وہ خود کو احکامِ شرعی کا پابند سمجھتے، اور اپنی ہستی کو قانون سے بالاتر تصور نہ کرتے تھے، ان مین اکثر دیندار مسلمان تھے، جن تک مظلوم کو رسائی آسان تھی اور جن کا انصاف اور اعتدال مشہور تھا، اکثر خلفاء کی طرح سامانیون کا بھی یہ دستور تھا کہ خود امیر یا خاندان کا کوئی اور فرد عدالتِ مظالم مین بیٹھ کر عمالِ حکومت کے تشدد کے خلاف نالشین سنتا اور قانونی تنازعات فیصل کرتا، علماے دین اور اہلِ فضل کی عزت کی جاتی تھی، ایک مرتبہ کسی متقی عالم کے احترام مین اسمٰعیل سات قدم پیچھے ہٹ گیا تھا، بخارا کے حنفی فقیہون مین جو شخص علم و فضل مین سب سے زیادہ ممتاز ہوتا اس کے حسبِ ہدایت مہمات مین فیصلے کئے جاتے، مفتی یا بعدہ شیخ الاسلام کا جو عہدہ ہوتا تھا اسی نوع کا ایک منصب سامانیون کے ہان بھی قائم تھا، اس عہدہ دار کو "استاد" کہا جاتا تھا، ایک عہدہ دار محتسب بھی ہوتا تھا اور یہ خدمت کسی بااثر شخص کو تفویض کیجاتی تھی جو بغیر کسی جانبداری یا خوف کے کام کرتا تھا، اس کے فرائض وہی تھے جو محتسبِ خلافت کے ہوتے تھے، یعنی جو لوگ شریعت کے خلاف عمل کرتے، خریدارون کو دغا دینے کی کوشش کرتے،

یا مقررہ محاصل ادا نہ کرتے ان کو سزا دیتا تھا، وزن اور پیمانون کے باب مین اتنی سختی برتی جاتی تھی کہ جب اسمٰعیل کو معلوم ہوا کہ خراج کا غلہ تولنے کے وزن حد مناسب سے کچھ زائد ہین تو ان کو بخارا منگا کر اس نے بقدر زیادتی کٹوا دیا، اور اس جرم کی مستقل سزا مقرر کر دی نظامِ حکومت یکسان ہونے کے سبب کیا تعجب ہے کہ آخر کار سامانیون کو اپنے صوبہ دارون کے ہاتھون وہی دن دیکھنا نصیب ہوا جو خود ان کے ہاتھون خلافت کو نصیب ہو چکا تھا، دونون جگہ مرکزی حکومت جب ضعیف ہو گئی تو صوبون کے حاکم آزاد ہو گئے، مگر خطبے اور سکون مین ان کے بالاتر حکمرانون کا نام باقی رہا، قرونِ وسطیٰ مین قومی احساس موجود نہ تھا، اس لئے سامانیون کو قراخانیون اور محمود غزنوی کے خلاف جنھون نے سامانی سلطنت کو تقسیم کر کے ایران کی سب سے پہلی خود مختار حکومت کا خاتمہ کر دیا، کوئی عام ہمدردی حاصل نہ ہو سکتی تھی،

جب ۳۹۰ھ ۹۹۹ء مین جب قراخانیون کا حملہ ہونے والا تھا اور سامانی حکومت معرضِ خطر مین تھی تو بخارا مین سامانی خطیب مسجدون کے منبرون پر کھڑے ہو ہو کر عوام کو جنگ پر آمادہ کرتے تھے اور سامانی امیر کی جانب سے یہ پیغام دیتے تھے کہ "ہم نے جس انداز سے حکومت کی تمھین معلوم ہے، ہمارے اور تمھارے درمیان تعلقات کس قدر خوشگوار رہے، یہ بھی تم جانتے ہو، اب ایک دشمن سر پر آرہا ہے، اب تمھارا فرض ہے کہ ہمارے ساتھ شریکِ جنگ ہو اور ہماری مدد کو پہنچو، لہٰذا خدا سے دعا کرو کہ ہمین مظفر و منصور کرے" اہلِ بخارا نے یہ پیغام سُن کر سامانیون کی استدعا پر

لبیک کہنے اور اعانت کرنے کی بجاے جنگ کے باب مین فقہاے اسلام سے
مشورہ کیا، مگر فقہا نے جنگ کے حق مین فتویٰ نہ دیا، اور کہا کہ "خان کے سپاہی اگر دوسرے
مذہب کے پیرو ہوتے تو جنگ مین شریک ہونا تمھارا فرض تھا، مگر جب لڑائی کا مقصد
دنیوی ہے تو کسی مسلمان کو جان خطرے مین ڈالنا اور ہلاکت کے منھ مین جانا روا نہین،
یہ قوم (دشمن) دیندار بھی ہے اور صالح بھی، اس لئے جنگ سے احتراز مناسب
ہے" مورخ کے بقول قراخانیون کی کامیابی اور سامانیون کی شکست و تباہیِ سلطنت
کا ایک بڑا سبب یہی ہوا،

خاص ایران مین سامانیون کا جو ملک تھا وہ محمود غزنوی کے ہاتھ آیا، لہذا
اب محمود اور عباسی خلافت کے تعلقات پر نظر ڈالنی چاہئے،



چھٹا باب

خلافت اور شاہانِ غزنوی

سامانی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو حکومت کا وہ شرعی اور قانونی حق جس کی بنا پر وہ فرمانروائی کے مجاز بن سکے تھے، پھر اپنے مفوض یعنی مرکزی حکومت کی طرف عود کرگیا، کیونکہ ازروے قانون اختیارِ حکومت اسی کو حاصل تھا، چنانچہ قضاۃ اور دیگر مذہبی عمال مقرر کرنے کا جو اختیار سامانیون کو ودیعت کیا گیا تھا سلب ہوگیا، اور اس صورت مین دارالقضا کے فتوے بھی جب تک کہ نیا امیر شرعی حیثیت سے حکومت پر مامور نہ کیا جاتا، قانونًا ناجائز تھے، سامانیون پر فتح پانے کے بعد محمود غزنوی کو ایک شرعی سند درکار تھی، تاکہ مفتوحہ ممالک پر قابض رہ سکے، ضرورت تھی کہ خلیفہ کی جانب سے اس کو حسب آئین شریعت فیصلۂ نزاعات کا اختیار تفویض کیا جائے، لہذا ظاہر ہے کہ خلافت کے ساتھ محمود کا طرزِ عمل مذہبی احکام کے علاوہ سیاسی مصالح پر مبنی ہوگا،

اس کی نیت اسی واقعہ سے ظاہر ہوجاتی ہے کہ معزول خلیفہ طائع کو سامانی اور

خود محمود جب کہ وہ دولت سامانیہ کے دامن سے وابستہ تھا، خلیفہ تسلیم کرتے رہے تھے مگر
اب طائع کی بجائے محمود نے قادر کی خلافت تسلیم کر لی، معزول خلیفہ کی بجائے قادر کو خلیفہ
مان لینے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ قادر کا انتخاب جائز سمجھنے لگا تھا، بلکہ سبب یہ تھا کہ اس کے بغیر
نہ تو حکومت کا قانونی اختیار حاصل کر سکتا تھا نہ حسب احکام شریعت تصفیہ نزاعات کا حق۔
۳۸۹ھ ۹۹۹ء میں سامانیوں پر فتح پانے کے بعد محمود نے پہلا کام یہ کیا کہ قادر کے نام ایک
عرضی تیار کی جس کی عبارت سراسر عجز و انکسار تھی، خود کو اور اپنے بھائی کو امیر المومنین کا غلام
بتایا، خلیفہ کو ہزاروں دعائیں دیں اور ہر ممکن خوبی اس کی طرف منسوب کی۔ اس عرضی میں
وہ لکھتا ہے کہ سامانیوں سے برسر پیکار ہونے کا سبب صرف یہ تھا کہ باوجود اس کے سمجھانے
کے سامانی فرمانروا امیر المومنین کی خلافت تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ "میں نے منصور بن
نوح سے انتہائی اصرار کے ساتھ درخواست کی، لیکن میری مودبانہ موعظت اور عقل افروز
نصیحت ایک نہ سنی گئی"۔ اس کے بعد واقعاتِ جنگ مفصل بیان کرتا ہے اور اپنی کامیابی
اور مابعد کارروائی کے متعلق کہتا ہے کہ "اس وقت جبکہ یہ عریضہ تحریر کیا جا رہا ہے، حق سبحانہ
نے تمام خراسان امیر المومنین کے زیر نگین کر دیا ہے، اور اب حال یہ ہے کہ خراسان کے
خطیب امیر المومنین کا نام لینے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے
ہیں، حق اور صداقت کو فتح ہوئی ہے اور امیر المومنین کا ساتھ دینے کے لئے ہر شخص دوسرے
سے زیادہ خواہشمند نظر آتا ہے۔ اس کے بعد یہ عرض ہے کہ بست و کشاد اور تصدیق و تنسیخ
کی کارروائی ابھی تک کچھ عمل میں نہ آسکی ہے، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ

بارگاہ خلافت سے میرے نام فرمان جاری نہ ہو جو میری تعمیر کی بنیاد بن سکے اور میرے لئے ایک ہدایت ہو کہ بہ تائید ایزدی مین اس کی پیروی کرون، اپنی فتوحات کو خلیفہ کی طرف منسوب کرنے کے بعد مفتوحہ ممالک یعنی خراسان اور گرد و نواح کے علاقون کی امیری کے لئے اپنی استدعا ان الفاظ مین پیش کرتا ہے، کہ "میرے آقا اور خداوند امیر المومنین اس عریضہ کو اگر شرف ملاحظہ بخشین اور اس غلام کو اپنے اوامر و نواہی پر مامور فرمانا چاہین تو فرما دین۔"

محمود کی درخواست موصول ہونے کے بعد خلیفہ قادر نے حکومت اور تاجداری کی سند مرحمت فرمائی اور تمام مفتوحہ ممالک کا جائز مالک بنا دیا، یمین الدولہ و یمین الملۃ کا خطاب بھی عنایت کیا گیا، جیسا کہ محمود کی عرضداشت سے ظاہر ہے اس کی قلمرو مین اس سے پہلے ہی خلیفہ کا نام خطبون مین پڑھا جانے لگا تھا، اب خلیفہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے نام کے ساتھ اس کے بیٹے غالب کا نام بھی داخل کر دیا جائے تاکہ غالب کے حقوق مسلّم ہو جائین، چنانچہ محمود نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور جمعہ اور عیدین کے روز خلیفہ کے ساتھ غالب کا نام بھی خطبون مین شامل ہونے لگا، نیشاپور کے مضروب سکون پر بھی غالب کا نام نقش کیا گیا،

اپنی سیاسی اغراض پوری کرنے کے علاوہ محمود نے عباسی خلافت کو تسلیم کر کے خلافت کو کافی تقویت پہنچائی، دنیائے اسلام مین خلیفہ کی عزت بڑھ گئی اور ایران مین اس کا اقتدار تازہ ہو گیا، ۳۸۹ھ/۹۹۹ء مین محمود کو پہلا فرمان امارت عنایت کیا گیا، اور ۴۱۷ھ/۱۰۲۶ء مین جدید

فتوحات تفویض کرنے کے لئے دوسرا فرمان ملا، محمود نے ان فراین کو حاصل کر کے خلافت کا وہ اقتدار جو سامانی دور کے ساتھ رخصت ہو گیا تھا از سر نو زندہ کر دیا، محمود کے جانشین مسعود نے بھی (۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء تا ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء) خود اپنی تخت نشینی اور خلیفہ قادر (۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء) کے انتقال پر فرمانِ خلافت کی استدعا کی اور فراین پائے، تجدید فرمان نے غزنویوں کو حلفیہ وعدوں کے ساتھ شرائط مندرجہ کا پابند کر دیا تھا، چنانچہ ان مواقع پر زرِ کثیر اور بیشمار تحائف خلیفہ اور ملازمینِ درگاہ کو نذر کرنا پڑتے تھے،

ماوردی کی تقسیم امارت کے بموجب غزنویوں کا شمار بھی قسم ثالث یعنی امرائے متسلطین میں کرنا چاہئے، یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایسے امراء کے لئے ماوردی نے جو سات شرائط قرار دی تھیں ان میں سے کتنی محمود اور مسعود نے خلافت کے حق میں پوری کیں،

۱- محمود اور مسعود دونوں خلیفہ کا احترام کرتے تھے، اور اس کو ہمیشہ دینی پیشوا تصور کرتے تھے، ۳۹۱ھ/۱۰۰۰ء میں خلیفہ واثق کی اولاد میں ایک شخص مسمی واثقی نے ابوالفیضی تمیمی فقیہ سے ساز کر کے ایک جعلی خط بنایا جس میں خلیفہ قادر کی جانب سے واثقی کو ولیعہد مقرر کیا گیا تھا، ہارون بن ایلک بغراخان کو اس شہادت پر یقین آگیا، اور اس نے اپنے زیرنگین ممالک میں احکام جاری کر دیئے کہ خلیفہ قادر کے بعد واثقی کا نام داخلِ خطبہ کر دیا جائے، بغراخان کے اس فعل نے دربارِ خلافت میں بڑی بے چینی پیدا کر دی، اب قادر نے مجبور ہو کر اس دعوے کی تردید کی، اور اپنے بیٹے ابوالفضل غالب کو جانشین قرار دیا، اس موقع پر محمود نے ابوالفضل کے نام پر خطبہ پڑھنے اور اس کے حقوق کی تائید ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ جب

واثقی محمود کی امداد طلب کرنے خراسان پہنچا تو اس نے مدعی خلافت کو اسیر کر لیا اور ایک قلعہ مین بند کر دیا، جہان سے موت کے دن تک رہائی نہ ہوئی، لیکن خلافت بنو عباس کی سب سے بڑی خدمت جو غزنویون نے کی وہ یہ تھی کہ عباسی خلافت کے خطرناک حریف فاطمیون کے پروپاغنڈا کا استیصال کرتے رہے، محمود ہی کی دلی خیر خواہی کا نتیجہ تھا کہ باوجود اپنی مساعی کے فاطمیون کو ایران کے اندر قدم جمانے مین کامیابی نہ ہوسکی، ۴۰۳ھ (۱۰۱۲ء) مین حاکم فاطمی نے محمود کو دعوتِ اطاعت دی تو محمود نے وہ مراسلہ بغداد روانہ کر دیا تاکہ منظر عام پر نذر آتش کر دیا جائے، پھر اسی سال محمود نے جب سنا کہ جرتی نامی ایک سفیر فاطمی دربار سے اسی مقصد کے لئے آیا ہے تو اس نے سفیر کو گرفتار کر لیا اور سر آمد فقہا کی ایک عدالت اس کے طرز عمل کا جائزہ لینے اور سزا تجویز کرنے کے لئے مقرر کی، اور آخر فتوے کے بموجب سفیر کو قتل کر دیا گیا،

۲- دوسری شرط یہ تھی کہ مذہبی امور مین خلیفہ کی صریح اطاعت واجب ہوگی، اس باب مین محمود کی انتہائی کوشش یہ رہی کہ خلیفہ کو ناراضگی کا موقعہ نہ دے، مگر بعض حالتون مین جب کہ ذاتی مفاد درمیان ہوتا امیر المومنین کی تعمیلِ ارشاد مشکل ہوجاتی تھی، تاہم محمود کا صلح جو طرز عمل اس مشکل کا ہر ممکن حل تلاش کرتا تھا، ایسی پیچیدہ صورتون مین محمود کا جو رویہ رہتا تھا اس کا بہترین مظہر ابو علی حسن معروف بہ حسنک کا واقعہ ہے، ۴۱۴ھ ۱۰۲۳ء مین حسنک حج بیت اللہ شریف سے واپس آرہا تھا، واپسی مین فاطمی دربار سے خلعت عنایت ہوا، اس واقعہ نے عباسی خلیفہ کو بہت مشتعل کر دیا، اور قدرتی طور پر

اس کو شبہہ گذرا کہ یہ تمام کارروائی محمود کے علم اور اجازت سے عمل مین آئی تھی، چنانچہ قادر نے بڑے پرزور الفاظ مین ایک مراسلت محمود کو روانہ کی جس مین حسنک پر قرمطی ہونے کا الزام لگایا گیا، اور محمود سے اس کے قتل کا مطالبہ کیا گیا، اس معاملہ مین بہت کچھ خط وکتابت ہوتی رہی، محمود بہت عاجز اور برافروختہ تھا، ایک روز اس نے کہا اس بے وقوف بوڑھے خلیفہ کو لکھ دو کہ عباسیون کی خاطر مین نے ساری دنیا سے بگاڑلی ہے، مین قرمطیون کے کھوج مین رہتا ہون اور جب کسی پر یہ الزام ثابت ہو جاتا ہے اسکو تیرون سے چھید کر نذرِ اجل کر دیا جاتا ہے، اگر حسنک کا قرمطی ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو امیر المومنین کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ اس کا حشر کیا ہوتا ہے لیکن حسنک میرا پروردہ اور مجھے فرزند و برادر کے برابر ہے، اگر وہ قرمطی ہے تو مین بھی قرمطی ہون، بہت غور و فکر کے بعد آخر فیصلہ یہ ہوا کہ حسنک کا خلعت اور وہ تحائف جو فاطمی خلیفہ نے محمود کیلئے بھیجے تھے، ایک ایلچی کے ہاتھ آگ لگا دینے کے لئے بغداد روانہ کر دیئے جائین، اسکے برعکس خلیفہ کے احکام کی تعمیل سے اگر امیر کا کوئی پنہان مقصود پورا ہوتا تھا تو فرمودۂ خلافت کو بہت زیادہ اہم تصور کر لیا جاتا تھا، یہی حسنک مسعود کے حکم سے سنگسار کر دیا گیا، کیونکہ تخت نشینی کے وقت مخالفت کرنے اور مغرور ہونے کے سبب سے مسعود کو اس سے کینہ پیدا ہو گیا تھا، کفر کا سابق الزام خلیفہ کی طرف سے عائد کیا گیا، لوگون کو یقین دلانے کے لئے دو آدمیون کو خلیفہ کے ایلچیون کا لباس پہنایا گیا، جو فرمانِ خلافت پہنچانے آئے تھے، فرمان مین تحریر تھا کہ حسنک قرمطی سنگسار کر دیئے جانے

کا مستحق ہے، تاکہ آیندہ لوگون کو امیر المومنین کے خلاف سرکشی کر کے فاطمیون سے خلعت لینے کی جراًت نہ ہو، حسنک جس وقت قتل ہو رہا تھا مسعود کا ایک پیام اس کو سنایا گیا اور وہ یہ تھا، "یہ سزا خود تمھاری خواہش کا نتیجہ ہے کیونکہ مین جب تخت نشین ہوا تھا تو تم نے چاہا تھا کہ مین تمھین مقتل تک پہنچا دون، مجھے تم پر رحم آتا تھا، مگر اب امیر المومنین فرماتے ہین کہ تم قرمطی ہو، لہذا امیر المومنین کے حکم سے تم قتل کئے جا رہے ہو۔"

جہان تک ذاتی مفاد کو صدمہ نہ پہنچتا محمود اور مسعود دونون خلافت سے تعلقات خوشگوار رکھتے تھے اور تمام عام اسلامی امور مین خلیفہ کو مدد دینے کی کوشش کرتے تھے، دونون نے خلیفہ کو مجبور کر کے غیر مفتوحہ ممالک کے لئے بھی فرمان حاصل کر لئے تھے، دونون نے خلیفہ سے عہد لے لیا تھا کہ قراخانیون سے براہ راست تعلق نہ رکھے گا، قراخانیون کو کوئی خطاب یا خلعت دیا جاتا تو غزنوی وساطت سے، محمود اس امر پر اتنا زور دیتا تھا کہ ابوالعباس مامون شاہ خوارزم نے محمود کے خوف سے خلیفہ کا عطا کیا ہوا خلعت علانیہ قبول نہ کیا، نہ خلیفہ کا مرحمت فرمایا ہوا لقب نام کے ساتھ اضافہ کیا، کبھی کبھی اپنی مصلحت کی بنا پر خلیفہ کی امداد طلب کی جاتی تھی، محمود جب مسعود سے ناخوش تھا اور بجائے اس کے دوسرے بیٹے محمد کو ولیعہد نامزد کرنا چاہتا تھا تو خلیفہ سے اس حکم کی درخواست کی گئی کہ سرکاری مراسلت مین محمد کا نام مسعود سے پہلے تحریر کیا جایا کرے، مسعود کو خلیفہ کا فرمان معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ حقوق کا فیصلہ تلوار کرتی ہے نہ کہ تحریر" لیکن ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء مین جب باپ کے مرنے کی خبر موصول ہوئی تو مسعود نے نہایت ادب اور احترام کے الفاظ مین خلیفہ کے اس

مراسلہ کا جواب لکھا جس مین علاء الدولہ بن کاکویہ حاکم اصفہان کی سفارش کی گئی تھی اور جو مدت سے لاجواب پڑا ہوا تھا، اسی خط مین فرمانِ خلافت کے لئے استدعا کی گئی اور فرمان حسب معمول مرحمت فرمادیا گیا،

۳۔ عام اسلامی ضروریات مین اعانت کرنے کا جہانتک تعلق ہے، خلیفہ اور غزنوی سلاطین دونون سنی المذہب تھے، ان کے مذہبی مفاد باہم متصادم نہ تھے، چنانچہ اس باب مین کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی تھی، قرمطی باطنی اور معتزلہ کا استیصال خلیفہ بھی چاہتا تھا اور ان تمام شورش انگیز عناصر سے ملک کو پاک کرنا خود غزنویون کی دنیوی اغراض مین داخل تھا، باطنیون کے انسداد مین محمود بالخصوص شدت سے کام لیتا تھا، ہزارون کے سر دار پر لٹکا دیئے گئے، ہزارون سنگسار کر دیئے گئے، اور ہزارون قید ہو کر غزنی پہنچ گئے، اُن کے کفریہ عقائد کی کتابین جو شتوا ونٹون پر لدی ہوئی تھین آگ مین ڈالدی گئین، محمود کی یہ فاتحانہ پالیسی دو مقصد پورے کرتی تھی، خلیفہ اور عام مسلمانون کی نگاہ مین ہندوستان کے جہاد نے اسکو شمشیر زنِ اسلام اور حامیِ ملت بنا دیا تھا، کفار پر جو اس کو فتوحات نصیب ہوتی تھین تمام ان سے وہ خلیفہ کو مطلع کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرتا تھا، مگر یہان بھی ایک دوسرا مقصد مدِ نظر تھا، کیونکہ حریف دیلمیون کی نظر مین یہ فتوحات اس کا اقتدار بیش از بیش کر دیتی تھین، اس کے علاوہ خود خلیفہ کے اقتدار کو تقویت پہنچتی تھی، اب خلیفہ محسوس کرتا تھا کہ اس کا تاج و تخت بہ نسبت سابق کے جب کہ دیلمی امیر اس کے آقا تھے، زیادہ محفوظ ہے، محمود نے آخر زندگی مین خلافت کو دیلمیون کے اثر سے آزاد کرنا چاہا،

۱۰۲۹ء؁ ۴۲۰ھ؁ مین جب مسعود کو رَے کی حکومت پر مامور چھوڑا گیا تو ہدایت یہ تھی کہ اصفہان کو فتح کرے اور اس کے بعد خلیفہ کو دیلمیون کی غلامی سے نجات دلادے، مگر پیشتر اس سے کہ یہ ارادے عملی صورت اختیار کرین محمود دنیا سے رحلت کرگیا،

محمود اور مسعود دونون حجاج کو آسایش پہنچاتے تھے، محمود نے بڑی بڑی رقوم بدوی قبائل کو نذر کین تاکہ زائرین کے قافلون کو غارت کرنے سے باز رہین، اسی طرح مسعود کاروانِ حجاج کی حفاظت اپنا فرض سمجھتا تھا، چنانچہ قادر کی وفات پر بغداد سے جب ایک سفیر تجدید فرمانِ خلافت کے لئے پہنچا تو مسعود نے اس کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی اور دیلمیون کو پیام دیا کہ اسی قسم کی آسانیان زائرین بیت اللہ کیلئے پیدا کرین،

۴۔ شرعی حقوق کے تحفظ کے لئے متقی اور ذی علم مفتی اور فقیہ منتخب کئے جاتے تھے اور ملک مین قضا کے عہدون پر ممتاز ہوتے تھے، ہر قصبہ مین ایک قاضی اور ہر صوبہ مین ایک قاضی القضاۃ رہتا تھا، قضاۃ کے مشاہرے معقول ہوتے تھے، اور بہ روایت نظام الملک ان کی برطرفی صرف اس صورت مین عمل مین آتی تھی، کہ اداے فرضِ منصبی مین غیر معمولی بداعمالی کے مرتکب ہون، داوگستری کے علاوہ قضاۃ کے ذمے اور بھی خدمات تھین، قاضی کا عہدہ بہت اہم تھا، کہا جاتا تھا کہ مسلمانون کا جان و مال اس کے اختیار مین رہتا تھا، مقامی حکام اس کے فتوے نافذ کرتے تھے، اور حکم عدولی کرنے والون کو سخت سزا ملتی تھی،

۵۔ غزنویون کا مالی نظام کیا تھا، اس کی تفصیلات معلوم نہین، مگر گمانِ غالب یہ ہے

کہ آمدنی کے مخصوص ذرائع وہی تھے جو خلافت کی قلمرو مین قائم کئے گئے تھے مستقل طور پر جن وسائل سے وصول یابی ہوتی تھی ان مین خاص طور پر قابلِ ذکر یہ ہین، اول مالگذاری دوم زکوٰۃ جو مسلم آبادی کے مال پر ڈھائی فیصدی کے حساب سے لیجاتی تھی، سوئم خراج اور تحائف جو ماتحت رئیس اور والیانِ ملک ادا کرتے تھے، چہارم چاندی اور سونا، جو کانون سے برآمد ہوتا تھا، پنجم غزنی کی حدود سے گذرنے والی اشیا کے درآمد و برآمد کے محاصل؛ ناجائز محاصل جنکو فقیہون کے اصطلاح مین مکوس کہتے تھے، غزنوی قلمرو مین لئے جاتے تھے یا نہین معلوم نہین ہوتا، بہر حال اس آمدنی مین محمود کی ہندی حروب اپنی غنیمت سے اضافہ کر دیتی تھین لیکن اسکی فاتحانہ یورشین اگرچہ محمود اور اس کے سپاہیون اور سردارون کو دولتمند کر دیتی تھین، مگر رعایا کے لئے غارت گر ثابت ہوتی تھین، ہندوستان کی دولت دربار کی شوکت بڑھانے کے لئے عالیشان عمارتون پر صرف ہوتی تھی، لہذا محمود کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی مستقل ضرورت رہتی تھی، ایک مہم پر روانہ ہونے سے قبل محمود نے حکم دیا کہ ضروری رقم دو روز کے اندر جمع کر لیجائے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رقم عمال سلطنت کو دینا پڑی جو بقول عتبی کے پشم تراشیدہ بھیڑون کی طرح ننگے کر دیے گئے، یہ کہنے کی ضرورت نہین کہ ان عمال نے جتنا امیر کو دیا ہوگا اس سے زیادہ غریب رعایا سے وصول کر لیا ہوگا، بیش قرار محاصل کا اثر یہ تھا کہ قابلِ زراعت اضلاع بڑی حد تک ویران پڑے رہتے تھے، آب پاشی کے وسائل بعض مقامات پر بالکل نابود ہو گئے تھے اور بعض جگہ خراب و خستہ ہوتے جاتے تھے، مسعود کے دور مین غریبون کی تکالیف اور بھی زیادہ

ہوگئیں، محمود کا قوی ہاتھ نہ رہا تو وہ امن بھی جو اس کے عہد میں میسر تھا رخصت ہوگیا،
ابولفضل سوری جو خراسان کا ناظم تھا اور جس سے امیر کو گرانقدر تحائف وصول ہوتے تھے قزاقوں
کی غارتگری میں حصہ لیتا تھا اور یہ قزاق بغیر کسی اندیشے کے اپنا کام کرتے اور رعایا کو جی بھر
کے لوٹتے تھے، اہلِ ملک عاجز آگئے اور زمینداروں نے ماوراءالنہر کے ترکی سرداروں
سے امداد طلب کرنا شروع کر دی، لہٰذا ماوردی کی شرط پنجم کا جزو ثانی صحیح معنی میں تکمیل نہ پا سکا،
مگر اسی کے ساتھ یہ واقعہ ہے کہ کبھی کبھی رعایا کی جائز شکایات کو امیر سنتا تھا، اور مصیبت کے
وقت کسی حد تک امداد کرتا تھا، جب اپنے عالیشان باغ کے مصارف کے لئے محمود
نے مزید محصول قائم کیا تو لوگوں نے احتجاج کیا اور بلخ کے ایک کوچے میں اس کو روک
لیا، محمود کو ان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور محصول اٹھا لیا گیا، ۴۰۱ھ ؍ ۱۰۱۱ء میں قبل از وقت برف باری
ہو جانے سے فصلیں خراب ہوگئیں، وزیر نے مالگذاری معاف کر دی اور کاشتکاروں
کو مویشی اور بیج خریدنے کے لئے قرضے دیئے گئے،

۵۔ مظلومین کی دادرسی کے لئے "عدالتِ مظالم" میں امیر روزانہ رونق افروز ہوتے
اور امیر و غریب کے ساتھ یکسان انصاف کرتے تھے، اس کے علاوہ تمام شہزادے، وزیر،
صوبہ دار، سپاہیوں کے سردار اور دیگر ارکینِ حکومت اپنی اپنی عدالتیں قائم کرتے تھے،
یہاں ایسے نزاعات جو ان کے محکموں سے متعلق تھے، یا جن میں فقہ دانی کی ضرورت
نہ تھی فیصل ہوتے تھے، محمود کا معیارِ عدل بہت بلند تھا، اضلاع میں عمالِ حکومت کی
کارروائیوں سے باخبر رہنے کے لئے اس نے جاسوس اور واقعہ نویس ساری قلمرو میں مقرر

کردیئے تھے، محمود کے سامنے شرافت اور مرتبہ کی بنا پر رعایت طلب کرنے کی کسی کو مجال نہ تھی،
وہ ہر ممکن صورت سے قانون کا احترام قائم کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ مقدمات جو خود امیر کے فیصل کئے
تھے قلیل التعداد ہوتے تھے، ملک میں قزاق پیشہ سرداروں کے قلعے جابجا موجود تھے اور ایک مقام سے
دوسرے مقام تک پہنچنا خطروں سے خالی نہ تھا، مگر باایں ہمہ اس فتنہ کو دور کرنے کیلئے کوئی مستقل کوشش نہ کی گئی،
۷۔ امیر محمود اور اسکے جانشین مسعود کو گوارا نہ تھا کہ سنی جماعت کے مسلمہ عقائد سے سرِمو کوئی انحراف کرے، وہ
تمام بے دین عناصر کا انسداد کر کے مذہب کا تحفظ کرتے تھے، مسلم رعایا کے عقائد کا احتساب کیا جاتا
تھا، اور گمراہوں کو سزا دینے کیلئے ایک عامل مقرر تھا، قرمطی، باطنی اور معتزلہ کی کتابیں جہاں ملتیں جلا دیجاتیں
اس طریق کار کا اثر یہ ہوا ہوگا کہ محمود اور خلیفہ کے پسندیدہ عقائد کو تقویت پہنچی ہوگی، اگرچہ امیر نہ مبلغ تھے
نہ تبلیغ اُنکے فرائض میں داخل تھی، پھر بھی ہم ان کو اس جذبہ سے خالی نہیں پاتے، اکثر مبلغین محمود کے سپاہیوں کے
پیچھے پیچھے غیر مسلموں کو دعوتِ حق دینے کیلئے پہنچتے تھے، نومسلموں کو مبادیاتِ دین تعلیم کرنے کیلئے محمود
نے استاد مقرر کردیئے تھے، اور تمام ملک میں مساجد تعمیر کرادی تھیں، غزنویوں کی خانگی زندگی بہت کم معلوم
ہے، مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا عمل مسلم ضابطۂ اخلاق کے مطابق ہوتا تھا، مذہبی فریضے وہ پابندی کیساتھ
ادا کرتے تھے، نماز مستقل طور پر پڑھتے تھے، قرآن پاک تلاوت کرتے تھے، اور زکوٰۃ نکالتے تھے، اسکے
علاوہ مساکین کی امداد کیلئے گرانقدر رقوم عنایت کرتے تھے، اہلِ علم اور معذوروں کو معقول وظیفے
دیتے تھے، مگر ان سب باتوں کے باوجود شراب سے شغل کرلیتے تھے، البتہ اُن کی محفلِ عیش ایک
مخصوص حلقہ تک محدود رہتی تھی، اور خود ان کے جلیس محتسب کے ڈر سے نشہ کی حالت میں
باہر نہ نکل سکتے تھے،

ساتوان باب

خلافت اور آلِ سلجوق

آلِ سلجوق نے جس وقت میدانِ سیاست مین قدم رکھا، اس وقت خلیفہ کا اقتدار تنزل کی آخری حد تک پہنچ چکا تھا، بغداد اور نواحی بغداد مین اس کا باعث دیلمی یعنی آل بویہ ہوئے تھے تو ایران مین سلاطین غزنویہ، یہ صحیح ہے کہ دیلمیون کے زوال پر خلیفہ نے اپنی عظمت دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشش شروع کر دی تھی، کبھی تو متاخر دیلمی امیرون کے ظلم و بیداد کے خلاف وہ عدل اور انصاف کے علمبردار بنتے تھے اور کبھی شیعہ اور سنی جماعتون کے مذہبی نزاعات مین ثالث کی خدمت انجام دیتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیلمیون کے آخر عہد مین نہ امیر اس قابل تھے نہ خلیفہ کہ سرکش ترکون کو اپنی قوت محسوس کرا سکین، ان کو تو کوئی قوی ہاتھ ہی قابو مین رکھ سکتا تھا، خود ترکون مین اس وقت کوئی قابل سردار نہ تھا، جو حکومت کا نظم و نسق سنبھال لیتا مگر وہ یہ بھی اجازت نہ دیتے تھے کہ آل بویہ کا کوئی قابل فرد اس خدمت کو انجام دے،

سنہ ۴۱۸ھ/۱۰۲۷ء مین انھون نے خلیفہ سے درخواست کی کہ کسی سردار کو ان کا حاکم مقرر

کر دیا جائے، لیکن جب یہ خدمت جلال الدولہ کو تفویض کر دی گئی تو انھون نے متعدد مرتبہ اس کے خلاف سرکشی کی، اس کے مسکن کو محصور کر لیا، اس کے اہلِ خاندان پر ظلم کئے، خود جلال کو مختلف طریقون سے ذلیل کیا، اور چند مرتبہ خلیفہ پر جبر کر کے اس کا نام خطبے سے خارج کرا دیا، اس دور بجموعی سیاسی حیثیت سے خلافت اور امارت دونون بے اثر ہو گئی تھین، اشرار کو اپنی حرکات سے باز رکھنے کے لئے کوئی طاقتور حکمران موجود نہ تھا، بدعملی، بدنظمی اور بداخلاقی ہر جگہ عام ہو گئی تھی،

اگرچہ خلیفہ کے سیاسی اختیارات عملی طور پر آل بویہ نے غصب کر لئے تھے، لیکن مصلحۃً وہ ضروری سمجھتے تھے کہ بعض احکامات خلیفہ کی مہر سے ہی صادر کئے جائین، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، بعض سیاسی امور مین شقے اور پروانے خلیفہ کے نام سے جاری ہوتے تھے بلکہ وزیر اور صوبہ دارون کے تقرر مین بھی خلیفہ کو جزواً مختار رہنے دیا گیا تھا، حکام کے نام فرداً فرداً فرامین عطا کرنے کے دستور سے یہ فائدہ تھا کہ خلیفہ کو ان لوگون سے براہ راست تعلقات قائم کرنے کا موقع حاصل رہتا تھا، اس کے علاوہ آلِ بویہ خلیفہ کی تمام ذمہ داریان پوری نہ کر سکتے تھے، چنانچہ ان کو سلطان کے لقب سے کبھی سرفراز نہ کیا گیا، لہذا آلِ بویہ کی قائم کی ہوئی سلطنت اگرچہ بجائے خود ایک واقعی چیز تھی، مگر آزادی کے مرتبۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی، اور شرعی حیثیت سے مکمل سلطنت نہ کہی جا سکتی تھی، ان کے برعکس غزنوی حکمرانون نے سلطان کا لقب خود اختیار کر لیا تھا، لیکن بغداد کے دربار مین ان کا اثر اتنا نہ تھا کہ اس لقب کو دربارِ خلافت سے منظور کرا سکتے، سلطنت فی الواقع وجود مین تو آ گئی تھی، مگر ہنوز

ایک منصوبہ حق کی حیثیت رکھتی تھی جو قانونی جواز کی سند سے محروم تھا اور جس کو سرکاری مراسلون اور سکون مین تسلیم نہ کیا جاتا تھا، تاوقتیکہ آل بویہ اور غزنوی امیرون کے اختیارات ایک سنی حکمران کی ذات مین جمع نہ ہوجاتے سلطنت کی قانونی بنیاد مستحکم نہ ہوسکتی تھی، بغداد اور ایران مین خلافت عباسیہ کی یہ حالت تھی کہ سلجوقیون کا سیلاب نمودار ہوا اور غزنوی اور آل بویہ دونون کو بے دخل کردیا،

یہ امر مسلمہ ہے کہ نومسلم ہونے کے باعث سلجوقی شدت کے ساتھ پابند مذہب تھے لہذا منصب خلافت کو تسلیم کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے مسعود سے نسا وغیرہ کے اضلاع اپنے نام مقرر کرانے کے لئے حاکم خراسان کو جو عریضہ لکھا گیا تھا اس مین سلجوقی امیر نے خود کو امیرالمومنین کا ادنیٰ پروردۂ دولت ظاہر کیا تھا، دوسری طرف خلیفہ کو اپنے اختیارات کے اظہار اور آل سلجوق سے اطاعت طلب کرنے کا جب موقع ملتا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا، ۴۲۹ھ؍۱۰۳۷ء مین جب مرو اور نیشاپور مین طغرل کی بادشاہت کا اعلان ہوا اور تمام مقبوضات مین اس کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا تو اس کے بھائی داوٗد نے ان علاقون مین قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ خلیفہ کے کان تک اطلاعین پہنچین، چنانچہ قائم نے اپنی ذمہ داری محسوس کی اور ایک سفیر طغرل کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ یہ ظلم و تشدد بند کردیا جائے، خلیفہ کا منشا پورا ہوا، طغرل نے قاصد کی مناسب تعظیم و تکریم کی اور اپنی حرکات سے باز آگیا لیکن آل سلجوق اور خلافت عباسیہ کا براہ راست تعلق اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ ۴۳۱ھ؍۱۰۴۰ء مین دندانقان کے مقام پر مسعود کو سلجوقیون کے مقابلہ مین شکست ہوئی

اس معرکے کے بعد سلجوقیون نے باہم مشورہ کرنے کے بعد خلیفہ قائم کو عریضہ ارسال کیا جس مین تحریر تھا کہ ہم نے خلیفہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے کبھی روگردانی نہین کی ہے، اور جہاد اور حج کے فرائض ادا کرتے رہے ہین، اس مراسلت مین محمود کی یہ شکایت بھی کی گئی تھی کہ اس نے سلجوقی امیر کے چچا اسرائیل کو قید خانے مین بند کر دیا تھا، درانحالیکہ ان کی طرف سے شکایت کا کوئی موقعہ نہین دیا گیا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی جتایا گیا تھا کہ مسعود امورِ سلطنت سے غافل اور شراب نوشی، عیاشی اور لہو و لعب مین مبتلا رہا، یہ بھی مذکور تھا کہ عمائدین و شرفاے خراسان نے غزنوی حکومت کی بیخ کنی مین ان کی رفاقت چاہی تھی، اس کے بعد مسعود کی شکست کا حال بیان کیا گیا تھا اور لکھا تھا کہ یہ فتح ہم کو تائید ایزدی سے نصیب ہوئی ہے جس کا شکر ادا کرنے کے لئے ہم ملک مین عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر رہے ہین اور رعایا پر ظلم روا نہین رکھتے، آخر مین یہ درخواست تھی کہ مفتوحہ ممالک کی حکومت تفویض فرمائی جائے تاکہ حسب آئینِ شریعت و احکامِ خلافت ملک کا نظم و نسق درست کیا جائے، مذکورۂ بالا خط کی عبارت صاف مظہر ہے کہ سلجوقیون نے کس مصلحت سے مجبور ہو کر خلیفہ سے سندِ حکومت کی استدعا کی تھی، اس درخواست کا سبب محض ایک مذہبی شرط کو پورا کرنا تھا، اب تک یہ اعتقاد تھا کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر امورِ مذہبی کا سرانجام مثلاً قضاۃ وغیرہ کا تقرر شرعاً جائز نہ ہو سکتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سلجوقیون کو خود اپنے ضمیر کی تسلی منظور تھی، نہ کہ رعایا کی تسکین، رعایا اس سے پہلے ہی اُن کے نام کا خطبہ پڑھ رہی تھی، طغرل کو سلطان المعظم کا لقب دیا جا چکا تھا، اور اس کی حکومت

عام طور پر مسلّم ہو چکی تھی، اس امر کی شہادت کہ خلافت کی منظوری محض مذہبی نقطۂ نظر سے ضروری سمجھی جاتی تھی اس واقعے سے ملتی ہے کہ سفیر کے روانہ ہوتے ہی سلجوقی امراء نے ان ممالک کو جو اس قدر آسانی سے ہاتھ آ گئے تھے باہم تقسیم کرنا شروع کر دیا، سفیر کے پہنچتے ہی خلیفہ نے اپنا ایک معتمد ملازم مہر و محبت کے پیام دے کر طغرل کے پاس روانہ کیا، جسکو یہ حکم بھی تھا کہ طغرل سے بغداد آنے کی درخواست کرے،

سنہ ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء تک طغرل کو معاملات بغداد کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی، سنہ ۴۴۷ھ میں خلیفہ کی اجازت سے وہ پہلی مرتبہ دارالخلافۂ اسلام میں حاضر ہوا، اس کا خیر مقدم بڑے تپاک کے ساتھ کیا گیا، رکن الدولہ کا خطاب عنایت ہوا اور حکم دیدیا گیا کہ ملک الرحیم کی بجائے اس کا نام خطبوں میں شامل اور سکوں پر مضروب کیا جائے با ایں ہمہ غز سپاہیوں اور اہلِ شہر کی شوریدہ سری کے سبب سے طغرل اور خلیفہ کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے، اہالیانِ شہر کو بہت سے مصائب برداشت کرنا پڑے اور خلیفہ کے احتجاج کے باوجود ملک الرحیم کو شروان پہنچا کر نظر بند کر دیا گیا،

سنہ ۴۴۹ھ ۱۰۵۷ء میں بغداد میں پھر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ طغرل کا خیر مقدم کیا گیا یہ اس خدمت کا صلہ تھا کہ طغرل نے دبیس بن صدقہ بن مزید اور بساسیری کو شکست دی تھی، جو ایک شیعی مذہب ترکی سردار تھا اور جس نے موصل میں خلافتِ بغداد سے باغی ہو کر مصری خلافت کی اطاعت قبول کر لی تھی، اس مرتبہ طغرل کو کاروبارِ خلافت سپرد کر دیے گئے، چنانچہ امیر المومنین نے "رئیس الرؤساء" سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "تمھاری خدمات کا

اعتراف کیا جاتا ہے اور تمہاری مساعی کے ہم ممنون ہیں، اللہ نے جن ممالک پر ہم کو حکمران کیا ہے، ان سب کا انصرام ہم تمہیں تفویض کرتے ہیں، خلقِ خدا کی خبرگیری اب تمہارے ذمہ ہے، تمہیں لازم ہے کہ خدا نے جو اختیار تمہیں عطا فرمایا ہے اس کو خداترسی کے ساتھ استعمال کرو، انعامِ الٰہی کے شکرگذار رہو، انصاف کو عام کرو، بداعمالیوں کی جڑ کاٹو اور فلاحِ رعیت کیلئے کوشاں رہو" اس کے بعد خلعت طوق اور کنگن مع ایک مطلا اور معطر دستار کے عنایت کئے گئے، جو اس امر کی دلیل تھی کہ عربی اور عجمی تاج متحد ہو گئے ہیں خلیفہ نے دو شمشیریں بھی مرحمت فرمائیں اور "ملک الشرق والغرب" کے لقب سے سرفراز فرمایا، طغرل نے خلیفہ کے دستِ مبارک کو بوسہ دے کر اور آنکھوں سے لگا کر اپنی بندگی کا اظہار کیا، تاریخ خلافت میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے اپنی قسم کا یہ پہلا فرمان تھا، طغرل سے پہلے کسی کو ان تمام ممالک کی حکومت جن پر خلیفہ منجانب اللہ مامور تھا" تفویض نہ کی گئی تھی، خود خلافت نے آخرکار سلطنت کے چہرے پر جواز کی مہر لگا دی،

۱۰۵۹ء/۴۵۱ھ میں طغرل نے تیسری مرتبہ بغداد حاضر ہو کر خلیفہ قائم کو پھر منصب خلافت پر فائز کیا، تو سلاطین کا وقار اور بھی افزوں ہو گیا، اس کی عدم موجودگی میں بساسیری نے قائم کو قید کر کے مصری خلافت کی اطاعت کا اعلان کر دیا تھا، اس موقع پر خلیفہ نے وہ ایک تلوار جو اسکے پاس باقی رہ گئی تھی، سلطان کو مرحمت فرمائی، اور رکن الدولہ کی بجائے رکن الدین کا لقب عنایت کیا،

طغرل کو بغداد پر قابض ہو جانے کا خیال بھی نہ تھا، درحقیقت وہ بغداد کی حکومت

خلیفہ کے ہاتھ مین چھوڑ دینا چاہتا تھا، مگر خلیفہ کی پست حوصلگی سے مجبور ہو کر جو طغرل کے وزیر نے اپنی ذہانت سے دریافت کر لی تھی، دارالخلافہ کو براہ راست زیر تصرف رکھنا پڑا، سیاسی اختیار کا جہان تک تعلق ہے، خلافت کی بے بسی عہد دیالمہ سے کچھ کم نہ تھی، بہر حال طغرل نے جس سلطنت کی بنیاد ڈالی اس کا مرتبہ سابق اور مابعد حکومتون سے کہین زیادہ بلند تھا،

بغداد مین سنی سلطنت قائم ہو جانے سے تاریخ خلافت کا ایک نیا دور شروع ہوا، ایران، عراق، شام اور ایشیاے کوچک فتح کر کے سلجوقیون نے ان منتشر بلاد اسلامیہ کو جن کے حکمران باہمد گر حریف و معاند تھے پھر شخص واحد کے زیر حکومت کر دیا این پول کے بقول انھون نے "مسلم کے تن افسردہ مین نئی روح پھونکدی، حملہ آور عیسائیون کو پسپا کیا اور سرفروش مجاہدین کی وہ جماعت پیدا کر دی جو حروب صلیبیہ مین مسیحی شکست کا سب سے بڑا سبب ہوئی"

سلجوقی اقتدار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ جہان جہان ان کا اثر تھا شیعی تحریک جو دیلمیون اور فاطمیون کی بدولت روز بروز وسعت پاتی جاتی تھی، سنی مذہب سے مغلوب ہو گئی، سلجوق کے عقیدے مین عباسی خلیفہ تمام صحیح المذہب مسلمانون کا امام تھا، چنانچہ وہ عباسی خلافت کے حامی اور فاطمی خلافت کے علانیہ دشمن بن گئے، اسماعیلیون کی خطرناک جدو جہد کو انھون نے پوری سرگرمی کے ساتھ روکا اور سنی علما کی حمایت مین ساعی رہے،

سلجوقی فتوحات کے سیلاب نے ان کے تمام مفتوحہ ممالک مین عباسی خلافت کا مذہبی اقتدار قائم کر دیا، اس کے علاوہ سلجوقی قوت کے خوف سے بہت سے

آزاد حکمران فاطمی امامت سے منحرف ہو کر عباسی خلافت کو تسلیم کرنے لگے، یہی زمانہ تھا جب کہ حرمین میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پھر سے شروع ہوا، عباسی خلافت کے حدودِ اثر میں ان دو مقامات کے شامل ہونے سے عباسیون کا وقار کہین زیادہ بڑھ گیا،

(خلافت کا منصب آل سلجوق کے نزدیک ایک مذہبی ادارہ تھا، چنانچہ انھون نے خلیفہ کو حسبِ سابق اسی کے حال پر چھوڑ دیا، خلیفہ کا انتخاب ہوتا تو وزیر، قضاۃ اور دیگر ارکینِ حکومت رسمی شوریٰ کرتے اور مرحوم خلیفہ کا فرزند بالعموم منتخب کر لیا جاتا، چونکہ اکثر خلفاء زندگی ہی مین ولیعہد نامزد کر دیتے تھے، انتخاب کا موقع ہی نہ رہتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ منصب ایک خاندانی جائداد بن گیا، جس کا ملنا مرحوم خلیفہ کی نامزدگی پر منحصر ہوتا تھا، گو بادی النظر مین یہ واقعہ صحیح نہین معلوم ہوتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ سلجوقی سلاطین نے خلفاء کے انتخاب مین کبھی مداخلت نہ کی، دیلمی دور کی طرح انھون نے خلفاء کو کبھی حکماً معزول نہین کیا، ان کے عہد مین خلیفہ اپنے گذارہ کی معین رقم اور ذاتی املاک کی آمدنی اطمینان کے ساتھ خرچ کرتا تھا، اس کو جائداد کی ضبطی یا نقدی کے مطالبات کا خوف نہ تھا، اس کے علاوہ مخصوص مواقع پر سلجوقی سلاطین کثیر رقوم اور بیش قیمت تحائف خلیفہ کو نذر دیتے رہتے تھے،

خلیفہ کو یہ بھی اجازت تھی کہ اپنا وزیر خود منتخب کرے، لیکن خلیفہ کے حقیقی اختیارات مین

چونکہ کوئی اضافہ نہ ہوا اس لئے وزیر کے اختیارات بھی وہی رہے جو سابق دور مین معتمد کو حاصل تھے، اور اس انقلاب سے صرف اتنا تغیر عمل مین آیا کہ معتمد کا لقب بدل گیا، باایں ہمہ اس عہدے کا یہ وقار تھا کہ لوگ بغیر معاوضہ کے حاصل کرنے کے خواہشمند رہتے تھے، سلاطین بھی اسکی اہمیت جانتے تھے، کیونکہ اُن کے اور خلیفہ کے باہم تعلقات کی شگفتگی بہت کچھ وزیر پر منحصر ہوتی تھی، اس لئے وزیر کے تقرر مین ہر سلطان دخل دیتا تھا، مگر انتہائی احتیاط کیساتھ ان وزیرون مین اکثر کا تقرر اور برطرفی سلاطین کی ہدایت سے عمل مین آئی،

ان اختیارات پر جو خلیفہ کے ساتھ مخصوص تھے اگر نظر کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور مین خلیفہ کو ان کے استعمال مین دیلمی عہد سے زیادہ آزادی حاصل تھی، اب بغداد کے سکون پر صرف خلیفہ کا نام ہی نہین بلکہ اس کے ساتھ امیرالمومنین کا لقب بھی نظر آتا ہے جو دیلمیون کے زمانے مین مفقود ہو گیا تھا، طغرل کے بعد بغداد کے سکون پر کہین سلطان کا نام نہین ملتا،

اس کے یہ معنی ہین کہ سلجوقیون کے دنیوی اقتدار کو دربارِ خلافت مین قانوناً تسلیم نہ کیا جاتا تھا، سلجوقی مملکت کے دوسرے حصّون مین کبھی رُو اور کبھی سکّے کی پشت پر خلیفہ کا نام اور لقب مسکوک ہوتا تھا،

خطبے کے باب مین سلجوقی سلاطین اس امر کی سخت پابندی کرتے تھے کہ ان کی تمام قلمرو مین خلیفہ کا نام ضرور پڑھا جائے، حالانکہ چند مرتبہ بغداد کے خطبون سے سلطان کا نام حذف ہو ہو گیا، مگر انھون نے کبھی انتقاماً خلیفہ کا نام خارج نہ کیا،

خطابات کی تقسیم مین بھی خلیفہ کو زیادہ آزادی حاصل تھی، اگرچہ بعض اوقات معمولی معمولی سلجوقی والیانِ ملک کو بڑے بڑے مہتم باشان خطابات دینے پر خلیفہ مجبور ہو جاتا تھا،

اب سلطان خلیفہ کا احترام کہین زیادہ ملحوظ رکھتے تھے، اور اس کا سبب صرف سیاسی مصلحت نہ تھی، بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ خلیفہ کی مذہبی قیادت مسلّم تھی، دنیوی اختیار کھو کر خلفا اپنی مذہبی سیادت اور شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے تھے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے خود سلجوقی حکمران خلیفہ کی مقدس حیثیت تسلیم کرتے تھے اور بعض مرتبہ محض اتفاقی امور کو اس کی روحانی قوت کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، خلیفہ کا مرتبہ ایسا تھا کہ سلاطینِ سلجوق اپنی بیٹیان اور بہنین اس کے نکاح مین دینا فخر سمجھتے تھے،

با این ہمہ سنّی سلطنت کے وجود سے خلافت کو ایک نقصان بھی تھا، جیسا کہ پہلے باب مین ذکر ہو چکا ہے، خلیفہ ایک جسم بے جان رہ گیا تھا، قابل اور قوی تر حکمران اسکو اپنے حال پر نہ چھوڑ سکتے تھے، مگر ایک طرف تو عباسی خاندان کو عزت اور احترام کیساتھ دیکھا جاتا تھا اور بعض احادیث ان کے حقِ خلافت پر حجت تھین، دوسری طرف خلیفہ کے سیاسی اور مذہبی فرائض کے درمیان کوئی خط فاصل قائم کرنا ممکن نہ تھا، جس کے باعث نظامِ حکومت ایسا پرپیچ ہو گیا تھا کہ منصبِ خلافت کو برقرار رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، ان دو وجوہ سے خلیفہ کا وجود مجبوراً روا رکھا گیا، امام غزالیؒ جو اوائلِ عہدِ سلجوق مین گذرے ہین اور جنکا شمار اسلام کے اجل علما مین ہوتا ہے مذکورہ بالا استدلال کی تصدیق کرتے ہین، امام صاحب فرماتے ہین کچھ لوگ سمجھتے ہین کہ امامت ختم ہو چکی، کیونکہ امام مین

ضروری اوصاف موجود نہین، اور اس کا قائم مقام تلاش نہین ہو سکتا ہی، مگر پھر کیا شریعت کی پابندی ترک کر دیجائے، کیا قضاۃ کو علٰحدہ کر دین اور تمام ارباب حکومت کو بے سود سمجھنے لگین، کیا نکاح کا دستور ختم کر دین اور اہلِ اختیار کے ہر فعل کو ناجائز قرار دے کر عوام کو گناہ مین مبتلا رہنے دین، اس کی بجائے یہی کیون نہ کرین کہ جس طرح گذر رہی ہے گذارے جائین، امامت کو فی الحقیقت برقرار تسلیم کرین اور ضرورت وقت اور حالاتِ موجودہ کو دیکھتے ہوئے حکومت کے ہر فعل کو جائز مانین۔ اگر صحیح معنون مین انتخاب عمل مین آتا تو سب سے زیادہ اہل اور مستحق شخص منصبِ خلافت پر مقرر ہو جاتا، مگر یہ نہ ہوا، تو قدرتی اسباب نے اپنا کام کیا اور جس کے پاس قوت سب سے زیادہ تھی وہی اختیار اور حکومت کا مالک بنگیا، واقعہ یہ ہے کہ خلافت کے منصب نے جو حیثیت اختیار کر لی تھی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ سلاطین وجود مین آجاتے، ان حالات مین خلافت کو قائم رکھنا ضرور تھا، مگر اسی کے ساتھ سلطنت کے لئے جگہ پیدا کرنا تھی، اس مشکل سے مفر حاصل کرنے کے لئے ایک درمیانی راہ تلاش کرنا پڑی ایک نمائشی رسم کے ذریعے سے سلطنت کو جواز کا مرتبہ دیا گیا، اور وہ رسم یہ تھی کہ خلیفہ کی طرف سے سلطان کے نام فرمان عنایت ہونے لگا، اس نمائش نے سلطنت کو جو درحقیقت زور اور قوت کے بل پر قائم ہوئی تھی شرعی اباحت کا جامہ پہنا دیا، :

اس وقت تاریخِ خلافت مین پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھنے مین آیا کہ خلیفہ کے دوشِ بدوش ایک سلطان بھی موجود تھا، جس کو اس مرتبۂ بلند کا قانوناً مستحق بنا دیا گیا تھا، لیکن اس کا اقتدار تلوار کی قوت پر مبنی تھا، اور اس قوت کے علاوہ اور کوئی طاقت اس کو معزول نہ کر سکتی

تھی، سنی المذہب سلطان کو اب وہی فرائض انجام دینے نہ تھے جو مسلم فقہا نے امرائے "اُولالامر" کے ذمّے عائد کر دیئے تھے، بلکہ اس سے یہ توقع کیجاتی تھی کہ تمام وہ ذمہ داریان پوری کرے گا جو خود خلیفہ کے فرائض مین داخل تھین، جب تک سلطان ان خدمات کو پورا کرتا رہتا، ملک کا نظم ونسق احکامِ شریعت کے بموجب درست رکھتا اور مخلوق کو سکون اور امن حاصل رہتا، اس کے خلاف ایک انگلی بھی نہ اٹھتی،

سلجوقی عہد مین سلطان کے لفظ مین ایک نئی اہمیت پیدا ہو گئی، اب یہ کوشش ہونے لگی کہ اس کا اطلاق اس شخص پر کیا جائے جو خلیفہ کے دنیوی اختیارات کا بلاشرکت غیرے مالک ہو، اصولاً اب یہ لازم ہو گیا کہ ایک وقت مین صرف ایک ہی شخص کو یہ منصب حاصل ہو، چنانچہ محمد بن ملک شاہ کے عہد تک ایران مین اس خاندان کے دوسرے حکمران "ملک" یا اسی قسم کے اور ادنٰی القاب پر قانع رہے، نظام الملک نے اپنے مشہور "سیاست نامہ" مین سلطنت کو قانونی شکل دینے کے لئے ایک جدید نظریے کی بنیاد رکھی اور اس کا مقصد غالباً یہی تھا کہ "سلطان" کے نئے معنی کو سندِ جواز مل جائے۔

روایت یہ ہے کہ منجملہ دیگر اشخاص کے نظام الملک سے بھی فرمایش کی گئی تھی کہ سیاسی مسائل پر ایک کتاب تصنیف کرے، تاکہ جو اصول اس مین قائم کئے جائین وہ ہر اسلامی حکومت کے مشعلِ ہدایت کا کام دین، اگرچہ کتاب کا اصل موضوع سیاست اور وہ طرزِ عمل ہے جو علمی نقطۂ نظر سے حکمرانون کو اختیار کرنا چاہیئے، تاہم فاضل مصنف نے سلطنت کی ابتدا اور سلاطین کے فرائض اور ذمہ داریون سے چند صفحات مین بحث کی ہے، سلطان کے

دنیوی اختیارات نظام الملک کے نزدیک خلیفہ کا عطیہ بھی نہین، اس کی بجائے سلطان کو مامور من اللہ تصور کرتا ہے، وہ کہتا ہے" ہر زمانے مین خدائے تعالیٰ اپنے بندون مین سے ایک کو منتخب کر لیتا ہے، اوصافِ سلطانی اس مین پیدا کر دیتا ہے اور مخلوق کی فلاح اور ملک کا امن اس کو سپرد کر دیئے جاتے ہین، انسانون کے دلون مین اس کا خوف اور اسکی عظمت قائم کر دی جاتی ہے تاکہ اس کے عدل کے سایہ مین لوگ امن سے زندگی بسر کر سکین" سلاطین کے فرائض کی نسبت وہ کہتا ہے کہ ان کو رعایا کے ساتھ انصاف اور عدل کا برتاؤ کرنا چاہیئے اور اس کے عوض دوہرے صلہ کی امید دلاتا ہے، اول تو سلطنت ہمیشہ ان ہی کے خاندان مین رہے گی اور دوسرے آخرت مین اللہ اجر عنایت فرمائے گا، بہت سے دلچسپ اور سبق آموز قصے نقل کر کے نظام الملک نے صراحت کیساتھ نہین تو ضمناً سلطان کو اپنے اور نیز عمال کے ہر تشدد ظلم اور غفلت کا جوابدہ ٹھہرایا ہے، مگر وہ رعیت کو حکمران سے بازپرس کرنے کا حق نہین دیتا، بلکہ کچھ عجیب دلائل دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ جب تک لوگ احکامِ شریعت کے پابند رہین گے، خدائے تعالیٰ ان پر اچھا فرمانروا مامور کرتا رہے گا" جب انسانون سے قانون شریعت کی نافرمانی اور تحقیر کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہین تو غضب الٰہی اس صورت سے نمودار ہوتا ہے کہ عادل حکمران کا سایہ ان کے سر سے اٹھ جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بدنظمی شروع ہو جاتی ہے، خون کی ندیان بہنے لگتی ہین، جو شخص ذی قوت ہوتا ہے حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے اور پھر مخلوق پر جبّارانہ فرمانروائی کرتا اور یہ اختیار خود جیسا چاہتا عمل کرتا ہے، چنانچہ گنہگار اور گنہگارون کے ساتھ پرہیزگار

بھی برباد ہو جاتے ہیں، آخرکار کوئی دوسرا شخص بہ تائیدِ الٰہی اختیار اور حکومت کا مالک بنجاتا ہے اور اللہ اس کو کاروبارِ سلطنت کی اصلاح کے لئے ضروری دانائی اور فراست سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے والے کہیں گے کہ نظام الملک نے سلطان کی جو تعریف کی ہے وہ اس عقیدے کی دوسری شکل ہے کہ سلاطین کو خدا کی طرف سے حکومت کا حق تفویض کیا جاتا ہے، بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ طوسی بھی سلطان کی حیثیت قریب قریب وہی قرار دیتا ہے جو اسلام سے پہلے ایران میں تسلیم کی جاتی تھی ساسانی بادشاہوں کے واقعات جن کو طوسی نے مثال میں پیش کیا ہے، اس گمان کو اور قوی کر دیتے ہیں، لیکن ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو یہ شبہات رفع ہو جاتے ہیں، کیونکہ عہدِ اسلام سے پہلے ایرانی سلاطین خدائی کے مدعی تھے، اور خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے، مگر طوسی نے سلطان کے دست و پا شرعی قیود میں جکڑ دیئے ہیں، اگلے سلاطین کی مخالفت ایک ناقابلِ تصور چیز اور گردن زدنی جرم تھی، مگر طوسی نے جہاں عدل و انصاف سے بحث کی ہے وہاں ایسے واقعات مثال میں پیش کئے ہیں جن سے اس باب میں سلطان اور عامی کی مساوات ظاہر ہوتی ہے، مگر اس کے برعکس طوسی کا نظریہ ماوردی کے بالکل متناقض ہے، حالانکہ ماوردی کا زمانہ بھی وہ تھا جب کہ خلیفہ کے پاس دنیوی حکومت کا شائبہ بھی نہ رہا تھا، ماوردی کا قول ہے کہ خلیفہ کا انتخاب ہونا چاہیئے، وہ قوم کے سامنے جوابدہ رہیگا، اور اگر ادائے فرض سے قاصر ہو تو قوم کو معزول کرنے کا حق ہوگا۔ اس کے برخلاف نظام الملک اس قسم کے خیالات

کا کوئی اظہار نہیں کرتا اور اپنے استدلال سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ناقابل فرمانروا خود رعایا کے گناہوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس کے نزدیک سلطان صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا، اسلام کے مسلّمہ نظریۂ حکومت سے طوسی کا یہ انحراف اس سبب سے واقع ہوا کہ جن حالات میں وہ گھرا ہوا تھا ان کی نوعیت ماوردی کی پیروی سے مانع تھی، اگر وہ اسی راہ پر چلتا تو خود اپنا مقصد فوت کر دیتا، اس کا اصل مدعا تو یہ تھا کہ سلطان کے اختیارات کو دوسروں کی احتیاج سے بے نیاز کر کے خود اپنی جگہ پر جائز قرار دیدے اور ساتھ ہی ساتھ خلافتِ عباسیہ کی مذہبی قیادت کو مسلّم رکھے، اصولاً سلطان کو اختیارِ حکومت خلیفہ کی جانب سے سپرد کئے جاتے تھے، اس لئے نہ تو اس کا منصب انتخابی بنایا جا سکتا تھا اور نہ اس کو رعیت کے سامنے جوابدہ قرار دیا جا سکتا تھا، یہ کہ نظام الملک خلافت کی صرف مذہبی قیادت تسلیم کرنے کیلئے آمادہ تھا، اس واقعے سے بہ آسانی ثابت ہو جاتا ہے کہ دنیوی اختیارات کی بحث میں وہ خلیفہ کا اقتدار نظر انداز کر دیتا ہے، اور سلطان کو براہِ راست خدا کے سامنے جوابدہ ٹھہراتا ہے، وہ تسلیم کرتا ہے کہ امورِ شرعیہ میں سلطان جو اختیارات حاصل ہیں ان کا مبدء اور مخرج خلیفہ ہے، کیونکہ وہ کہتا ہے کہ قاضی خلیفہ کے نائب اور اس حیثیت سے اس کے طریق کار کے پیرو ہیں، مگر اسی کے ساتھ سلطان ان کو مقرر کرتا ہے، اور اس حیثیت سے وہ سلطان کے فرائض انجام دیتے ہیں، بہ الفاظ دیگر اس کا دعوی یہ ہے کہ سلطان ان عمّال کو مقرر کرنے کا اختیار خلیفہ سے حاصل کرتا ہے، اس کے علاوہ خطابات کی بحث میں وہ معترف ہے کہ سلجوقیوں کو خلیفہ کی جناب سے جو خطاب دیئے گئے جائز تھے، واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام

کوشش ایک ایسی وسطی راہ نکالنے کے لئے ہے جس سے خلیفہ کی مذہبی سیادت تسلیم کرنے کے ساتھ سلطان کو بھی مامور من اللہ کہا جا سکے،

اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ امام غزالی نے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہین، وہ فرماتے ہین" جاننا چاہئے کہ خدا نے نوعِ انسان سے دو گروہ منتخب کر لیے ہین، اوّل انبیا اور مرسلین جو بندون کو اس کی معرفت اور اطاعت کی راہ دکھاتے ہین اور دوسرے سلاطین جو مخلوق کو باہم جنگ وجدال کرنے سے باز رکھتے ہین، ان کے ہاتھ مین خدا نے بندوبست کی عنان دے دی ہے، اپنی حکمتِ کاملہ سے خلق کی فلاح وبہبود کا ان کو ذمہ دار بنا دیا ہے، اور اپنی قدرت سے ان کو بلند ترین مرتبہ پر پہنچا دیا ہے، جیسا کہ احادیث مین ارشاد ہے .... لہذا جاننا چاہئے کہ جن کو اللہ نے منصبِ سلطانی عطا فرمایا اور ظل اللہ کا مرتبہ دیا ہے ان کی محبت ہر شخص پر فرض ہے، لازم ہے کہ ان کی اطاعت اور پیروی کیجائے ان سے مقابل یا سرکش ہونا ناجائز ہے، ہر مومن کا فرض ہے کہ بادشاہون اور سلاطین کی محبت دل مین رکھے اور ان کے احکام بجالائے"۔

دوسری تصنیف مین امام صاحب پھر اس بحث کو چھیڑتے ہین اور خلیفہ اور سلطان کا تعلق واضح کرنا چاہتے ہین "اگر کوئی بداعمال اور ظالم سلطان اپنی فوجی قوت کے باعث بمشکل معزول کیا جا سکتا ہو یا اس کے معزول کرنے مین ناگوار خانہ جنگی کا اندیشہ ہو تو ضرورۃً اس کو بحالہٖ چھوڑ دینا چاہئے، اور جس طرح امیر کی اطاعت کیجاتی ہے اس کی بھی اطاعت کیجائے، کیونکہ احادیث مین اطاعتِ امیر اور ترکِ اطاعت کے متعلق صاف اوامر ونواہی

موجود ہین، اب سمجھنا چاہئے کہ بنو عباس کا وہ فرد جو منصبِ خلافت کا حامل بنایا جاتا ہے، اس عہدے کو اس معاہدے کے ساتھ قبول کرتا ہے کہ حکومت کے فرائض مختلف امیر اپنے اپنے ممالک مین انجام دیتے رہین گے، لیکن وہ خلیفہ کے مطیع و حلقہ بگوش رہین گے، اگر ہم یہ فتوی دے دین کہ تمام حکومتین ناجائز ہین تو تمام رفاہی ادارے بھی ناجائز متصور ہون گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ نفع کی ہوس مین سرمایہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا، واقعہ یہ ہے کہ آجکل حکومت محض حربی قوت پر مبنی ہے، اربابِ قوت جس کسی کی اطاعت قبول کرلین وہی خلیفہ ہے، اور ہر آزاد حکمران جبتک کہ وہ خطبہ اور سکے کے باب مین خلیفہ کا اقتدار تسلیم کرتا ہے، سلطان کہے جانے کا مستحق ہے، اور اس کے احکام اور فیصلے اس کے حصۂ ملک مین جائز تصور کئے جائین گے،

اس دوعلی نظام کے حق مین سب سے زیادہ مہلک تجویز وہ تھی جو عمید الملک نے طغرل کے سامنے پیش کی، اور وہ یہ تھی کہ طغرل بغداد پر قبضہ کرلے، بیرونِ بغداد خلیفہ اور سلطان کا تصادم روکا جاسکتا تھا، بغداد کے اندر اس مشکل کو مصالحت کے ساتھ حل کرلینا ممکن نہ تھا، بغداد مین خلیفہ کے ہوتے ہوئے کوئی سلطان اختیاراتِ کلی حاصل نہ کرسکتا تھا، پھر نائب کے ذریعہ سے تو یہ امر اور بھی زیادہ ناممکن تھا، اسلام مین مذہبی اور دنیوی اختیارات کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہین ہے، اس سبب سے ہر خلیفہ کو جس مین قوتِ عمل ہوتی موقعہ حاصل تھا کہ بغداد مین دنیوی اور مذہبی دونون امور کی قیادت اختیار کرلے، قدرتی طور پر خلیفہ کی مداخلت سلطان سے زیادہ موثر ہوتی تھی، کیونکہ

سلطان موقعہ پر موجود نہ رہتا تھا، مزید ان جیسا کہ عہد دیالمہ مین واقع ہوا، چند اختیارات خلیفہ کی ذات سے وابستہ تھے، جن کو دوسرا شخص استعمال نہ کرسکتا تھا، کسی دور دراز مقام کے لئے یہ اختیارات کسی نائب کو سپرد کئے جاسکتے تھے، مگر خود مستقرِ خلافت مین ان کا کسی اور شخص کو تفویض کیا جانا ایک مہمل بات تھی، مثلاً قضاۃ، خطیب، امام اور دیگر مذہبی حکام بغداد مین خود خلیفہ کے حکم سے مقرر کئے جاتے تھے، قضاۃ کی تنخواہین خلیفہ کے خزانے سے ملتی ہون یا سلطان کے، ان کے شرعی اختیارات خارجی مداخلت سے محفوظ تھے، ان مین بعض تو ایسے بے باک اور آزاد ہوتے تھے کہ ادائے فرض مین سلطان کو بھی نہ بخشتے تھے، مدرسۂ نظامیہ کے مدرس بھی خلیفہ کی اجازت کے بغیر مقرر نہ ہوسکتے تھے، یوسف الدمشقی کو اسی بنا پر جمعہ کی نماز مین شریک نہ ہونے دیا گیا۔ اور ان کی بجائے سلطان مسعود نے جس مدرس کو مقرر کیا اس کو بھی اپنی خدمات انجام دینے کا موقعہ نہ مل سکا حتی کہ خود سلطان کو خلیفہ سے سفارش کرنی پڑی،

شہر کی اخلاقی حالت اور پاکیزگی کا بھی خلیفہ ذمہ دار تھا، سنہ ۴۶۶ھ (۱۰۷۴ء) مین سیلاب سے پہلے سربرآوردہ شہریون نے خلیفہ قائم کے حضور مین درخواستین پیش کی تھین جنین یہ شکایت کی گئی تھی کہ شرابخواری اور بداعمالی کی کثرت ہے، نیز خلیفہ سے استدعا تھی کہ معصیت خانون کا استیصال کردے، خلیفہ مقتدی نے مخلوق کے اخلاق درست کرنے کے لئے کئی قوانین نافذ کئے، کسبیان اور گانے والیان شہر بدر کردی گئین اور ان کے مکانات فروخت کردیئے گئے، حمام مین برہنہ بدن داخل ہونا ممنوع قرار پاگیا، اور بانس کی چھتریان

یا مینارے جو کبنے کو پرندون کے لئے بنائے گئے تھے توڑ ڈالنے کا حکم دیا گیا، کیونکہ ان سے لوگون کے زنان خانون مین تاک جھانک کرنے کا ناجائز مقصد پورا کیا جاتا تھا، آخر مین ایک فرمان یہ بھی نافذ ہوا کہ ملاح اور کشتیبان اپنی کشتیون مین مردون اور عورتون کو ساتھ سوار نہ کرین مذہبی نزاعات مین جو کبھی اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین اور کبھی اثنا عشریون اور حنبلیون کے درمیان ہوتے رہتے تھے خلیفہ کی امداد طلب کیجاتی اور اس کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا، تمام مذہبی معاملات مین خلیفہ کی رائے بالاتر حیثیت رکھتی تھی جس کی تردید آسانی سے نہ ہو سکتی تھی،

سکون کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بغداد مین خلیفہ اپنے سیاسی اختیارات سے دست بردار نہ ہوا تھا، ان سکہ جات پر جو مستقر خلافت مین مسکوک ہوتے تھے طغرل کے بعد کسی سلجوقی سلطان کو اپنے نام کے ساتھ "سلطان" کا لقب شامل کرنے کی اجازت نہ دی گئی، یہ امر کہ خلیفہ اب بھی اہل بغداد پر محصل قائم کر سکتا تھا، دعویٰ مذکور کی مزید تائید کرتا ہے، برخلاف اس کے سلطان بغداد کے محصل کا ٹھیکہ لے لیتے تھے اور انتظام شہر کے ذمہ دار ہوتے تھے، اس مقصد کے لئے ان کی طرف سے بغداد مین ایک شحنہ مقرر ہوتا تھا جس کا فرض تھا کہ شہر مین امن وامان قائم رکھے، شحنہ کا منصب خطرناک ہوتا تھا، سلطان کا نائب ہونے کی حیثیت سے وہ پابند تھا کہ اپنے فرائض سلطان کے حسب الحکم انجام دے، دوسری طرف اس کو سلطان سے بھی بالاتر حاکم یعنی خلیفہ سے سابقہ تھا، جو کم سے کم بغداد کے حدود مین ابھی تک خود کو مختار کل تصور کرتا تھا، شحنہ اگر غفلت یا بے عنوانی

کا مرتکب ہوتا تو لوگ سلطان کی بجائے خلیفہ سے فریاد کرتے تھے جو بغداد مین موجود تھا، اور جس تک رسائی آسان تھی، چنانچہ بغداد مین دوعملی قائم ہوگئی تھی، اور ایک نہ ایک روز ان دو خداوندون کے باہم تصادم ناگزیر تھا،

تاہم نظام الملک کے عہد مین ان دو آقاؤن کے درمیان کوئی کشمکش پیدا نہ ہوئی، جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ سلاطین غیر مسلمون کے ساتھ جنگ کرنے مین مصروف رہے اور دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود نظام الملک ▪ دنیاے اسلام کو خلیفہ کے زیر قیادت متحد دیکھنا چاہتا تھا، چنانچہ اس کا عاقلانہ بندوبست اور دانشمندانہ مشورے نے خلیفہ اور سلطان کو دست و گریبان نہ ہونے دیتے تھے، اس عہد مین اگر خلیفہ نے بغداد کے سیاسیات مین دخل دینے کی کبھی کوشش کی تو نظام الملک نے اس کا مصالحانہ طرزِ عمل سے جواب دیا، دوسری طرف خلیفہ بھی اسی قسم کے رویہ کا اظہار کرتا تھا، اور معمولی بات پر جھگڑا پیدا کرنا پسند نہ کرتا تھا، حتیٰ کہ بغداد کا شحنہ نائب السلطان کی حیثیت سے نوبت و نقارہ جو شاہی خصوصیات مین داخل تھے استعمال کرنے لگا، اور خلیفہ نے تعرض نہ کیا، مگر ان دو قوتون کے درمیان اتفاق قائم رکھنے کے لئے سیاسی دور اندیشی کی بہت ضرورت تھی، چنانچہ اتنے عرصے تک نزاع نہ پیدا ہونا نظام الملک کی قابلیت کا ثبوت ہے، وہ اختلاف جو خلیفہ اور ملک شاہ کے درمیان رونما ہوا کسی سیاسی واقعے کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اس کا اصل سبب ملک شاہ کی دختر اور خلیفہ مقتدی کی نامسعود شادی تھی،

نظام الملک کا انتقال اور کچھ ہی عرصے کے بعد ۴۸۵ھ (۱۰۹۲ء) مین ملک شاہ کی رحلت

ایک طویل جنگ کا پیش خیمہ تھی جو تخت و تاج کے لئے مرحوم سلطان کے بیٹون مین جاری رہی، اس جنگ کے دوران مین خلیفہ کو اپنی خود مختاری کے اظہار کا غیر متوقع موقعہ ہاتھ آیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نظام الملک کے عہد مین خلیفہ کی سیاسی قوت اتنی ضعیف ہو چکی تھی کہ وہ اس طویل خونریزی سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ خلیفہ کی قوت کا اندازہ صرف اس امر سے ہو جاتا ہے کہ اس کو اپنے اختیارات حکومت نابالغ امیرون کو تفویض کرنا پڑے، اس وقت اسلامی سیاسیات مین عجیب مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی تھی، نابالغ شخص کو خلیفہ بنا دینا تو ناجائز تھا، حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مملکت اسلامیہ کی اصل فرمانروائی سے خلیفہ کو تعلق نہ رہتا تھا، لیکن سلطان کا منصب جو خلیفہ کی جانب سے انصرام مہمات ملکی کا ذمہ دار تصور کیا جاتا تھا، شیر خوار بچون کو مل سکتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محمود کے ناوقت اور ناگہانی انتقال کے بعد اس کے جانشین محمد اور برکیارق دونون بہت کمسن نہ سہی مگر نابالغ تھے، مگر ان کو تخت و تاج سے محروم کرنے کا کوئی طریقہ ممکن نہ تھا، کیونکہ ان کا حق زور شمشیر پر مبنی تھا، خانگی زور آزمائی مین جو کامیاب ہو جاتا اسی کا نام بغداد کے سکون اور خطبون مین شامل کر لیا جاتا، اور اسی کے ساتھ خلیفہ کی اجازت بھی مل جاتی جو بالکل رسمی اور نمائشی چیز تھی، نتیجہ جنگ معلوم ہوتے ہی لوگ خود ہی فاتح سلطان کے لئے دعائین مانگنا شروع کر دیتے، اور اگر فیصلہ مشتبہ ہوتا تو خطبے مین صرف فقط سلطان پڑھا جاتا اور کسی خاص نام کا ذکر نہ ہوتا، خلیفہ اپنی بے بسی محسوس کرتا تھا، چنانچہ وہ خاموشی کے ساتھ دونون بھائیون کے باہم فیصلہ جنگ کا انتظار کرتا رہا، فریقین کبھی جنگ چھیڑ دیتے تھے، کبھی شرائط صلح طے ہوتی تھین، ممالک تقسیم کئے جاتے

تھے خطبے مین نام شامل ہونے کے حق پر سمجھوتے ہوتے تھے اور بعدہٗ خلیفہ کو مطلع کر دیا جاتا تھا،
ذاتی اختلافات اور رنجشون کے باوجود سلطان اور خلیفہ باہم نباہ کئے جاتے تھے خلیفہ تو مجبور تھا اور بجز
اس کے اسکو دوسرا چارۂ کار ہی نہ تھا سلطان مذہبی جذبات سے متاثر رہتا تھا، اور خلیفہ سے الجھنا بے سود سمجھتا
تھا، اگر وہ خلیفہ کا احترام نہ کرتا یا خلق کو ستاتا تو عوام الناس کی ہمدردی سے محروم ہوجانے کا خطرہ تھا،

اس وقت تاج و تخت کیلئے جو مسلسل جنگ جاری تھی اسکی بدولت بغداد کی حکومت مین استقلال و
استحکام مفقود ہوگیا تھا چنانچہ شحنہ بغداد امن و امان قائم رکھنے کی بجائے خود سری اور ظلم سے کام لینے لگا، خلیفہ
نے محسوس کیا کہ ان بے عنوانیوں کا انسداد اسکا فرض تھا، مگر بجز اسکے کہ ظلم کرنے والون کی خدمت مین قاضیون
کو بھیجکر مظلومون کی وکالت کرائے، مداخلت کا اور کوئی طریقہ خلیفہ کے بس مین نہ تھا، چنانچہ حلہ (عراق) کے ایک
عربی شیعہ سردار سیف الدولہ صدقہ سے مداخلت کی درخواست کی گئی جو ایک مہلک غلطی ثابت ہوئی سیف الدولہ
نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر مخلوق کو لوٹنا شروع کر دیا، اور بعض مرتبہ شہر مین قتل و غارت کا سلسلہ بند کرانے
کیلئے خلیفہ کو اس شیعی امیر کے مجوزہ شرائط قبول کرنے پڑے، بغداد کے ارباب حکومت مین یہ تغیر و تبدل شحنہ
کی طاقت غیر مستحکم کر دینے کا باعث ہوا، سلطان کی مسند جب ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہوتی تو بغداد
کا شحنہ بھی تبدیل کیا جاتا، چنانچہ کبھی کبھی رقیب امیدوارون مین باہم جنگ و پیکار شروع ہوجاتی، اس صورت حال
نے اہل شہر کا حال اور بھی خراب کر دیا تھا، کیونکہ ایسی جنگ و جدال مین ہمیشہ اہل شہر ہی پر مصیبت آتی تھی لڑائی
مین کبھی کبھی خلیفہ سے امداد طلب کیجاتی تھی اور خلیفہ اسی کی اعانت کرتا تھا، جو بغداد مین موجود ہوتا تھا،

بہرکیف خلیفہ کو اپنی بے بسی کا احساس تھا اور بہ حیثیت مجموعی اسکا معمول یہ تھا کہ واقعات کو اپنی حال
پر چھوڑ دیا جائے، وہ بغداد ہی کے معاملات پر قانع رہتا تھا، اور اسی مین خوش تھا کہ بغیر کسی ذمہ داری کے

ذاتی آمدنی سے متمتع ہوتا رہی اور اپنے خانگی معاملات سے ہی دلچسپی رکھے، جس وقت صلیبی مجاہد مسلم ممالک مین میدان پر میدان جیت رہے تھے، نہ خلیفہ نے جنبش کی نہ سلطان نے بار بار خلیفہ کی خدمت مین استدعا کیجاتی تھی مگر مسلم قوم کا پیشوا ہونے کی حیثیت سے نہ وہ خود امداد کرتا تھا، اور نہ سلطان سے اصرار کرتا تھا کہ فریضہ جہاد ادا کرے یا کم سے کم مسلمانون کے جان و مال کی حفاظت کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو صرف ۵۰۴ھ ۱۱۱۰ء مین جبکہ دارالخلافہ کے کثیر التعداد علما جو اقتدار اسلامی قائم رکھنے کیلئے بیچین تھے، ایک وفد لیکر حاضر ہوے تو خلیفہ اور سلطان نے مجبورًا ہو کر ان کی درخواست پر التفات فرمایا،

۵۱۵ھ ۱۱۱۹ء مین محمود کو سنجر کے ہاتھون شکست نصیب ہونے کے بعد جب سنجر کو بغداد مین فرمانروا تسلیم کیا گیا تو ارتقاے سلطنت کی تاریخ مین ایک جدید اقدام ہوا اس کے بعد سنجر کو باضابطہ سلطان تسلیم کر لیا گیا اور صرف بغداد ہی مین نہین بلکہ ایران کے تمام ان ممالک مین جہان سلجوقی اقتدار قائم تھا خطبہ اور سکہ مین اس کا نام آنے لگا، تاریخ خلافت مین یہ پہلا موقع تھا کہ کسی فرمانروا کو بغداد پر متصرف ہوئے بغیر یہ عزت بخشی گئی اس واقعہ نے ایک اہم مثال قائم کر دی، بعد کو طاقتور حکمران اس مثال کو سند پکڑتے تھے اور بغداد کے خطبے مین نام شامل ہونے کا مطالبہ کرتے تھے، حالات کو اس واقعہ نے اور بھی پیچیدہ بنا دیا کہ وہ فرمانروا بھی جو بغداد پر متصرف ہوتے تھے خود کو سلطان کہتے تھے، جیسا کہ ان کے سکے شہادت دیتے ہین، چنانچہ ضروری ہو گیا کہ بغداد کے واقعی حاکم ہونے کی حیثیت سے خطبہ اور سکے مین ان کے نام داخل کیے جاتے سلاطین کی ان دو اقسام مین فرق یہ تھا کہ سنجر کا نام تو عراقی سلاطین کی قلمرو کے خطبہ اور سکہ مین داخل تھا لیکن سنجر کے ملک مین عراقی سلاطین کو یہ حقوق حاصل نہ تھے،

جس وقت سنجر اور اسکے بھتیجے محمود کے درمیان صلح ہو گئی، سنجر نے محمود کو اپنا جانشین نامزد کر دیا

تمام ممالک اسلامیہ میں اسکا نام داخل خطبہ کرنے کا حکم دیدیا، اور بعدہ اس امر کی ایک اطلاع خلیفہ کو بھی روانہ کردی خلیفہ کے خصوصی حقوق پر سلاطین جو دست درازی کرتے تھے یہ اسکی انتہا تھی اب سلطان سنجر کے اختیار میں تھا کہ عراق کی حکومت جس کو چاہے عنایت کرے لیکن عراق کیساتھ بغداد بھی وابستہ تھا، اسلئے فرمانروائے بغداد کو خلیفہ کی اطاعت کا حلف لینا اور اس سے سند حکومت حاصل کرنا ضروری تھا، حالات پیچیدہ ہوگئے تھے اور محمود کے بعد مدعیان حکومت میں جو سلسلہ محاربات چھڑا اس نے اور بھی پیچیدگیاں بڑھا دیں، دونوں محارب رقیب سلطان سنجر سے جو عراق کا حاکم واقعی تھا اور خلیفہ سے جو سلطنت کا مالک مجاز تھا، امداد کے مستدعی رہتے تھے۔

۵۱۱ھ ۱۱۱۷ء میں سلطان محمد کی وفات پر سلجوقی خاندان کا اتحاد ختم ہوگیا اسکے بیٹے محمود کی تخت نشینی میں پہلے تو اُسکا چچا سنجر اور پھر اسکا بھائی مسعود جو موصل کا حاکم تھا، مزاحم ہوئے، چنانچہ بغداد پر محمود کا تصرف کبھی رہا کبھی نہ رہا اس خاندانی جنگ کا سبب مشہور صدقہ کے بیٹے دبیس کی سازشیں تھیں خلفا کو اب سیاسی اقتدار قائم کرنے کا موقعہ ملا اور وہ سلجوقی سلاطین سے زور آزمائی کے لئے تیار ہوگئے،

دبیس کی کوشش سے خلیفہ مسترشد (۵۱۲ھ ۱۱۱۸ء – ۵۲۹ھ ۱۱۳۵ء) کو وہ قوت منظم کرنے کا موقعہ ملا جو بعد کو سلجوقی سلاطین کے مقابلہ میں خود مسترشد اور اس کے جانشینوں کے کام آئی، دبیس محض لٹیرا تھا اور اس کا طرز عمل کسی اصول کا پابند نہ رہتا تھا، وہ نہ سلطان کی سنتا تھا نہ خلیفہ کی لیکن اسکی مصلحتیں مقتضی ہوتیں تو دونوں سے معافی مانگ لیتا تھا، بغداد اور آس پاس کے اضلاع میں اسکی غارتگری مسلسل جاری رہی اس واقعہ نے خلیفہ کو محافظ کا فرض ادا کرنے پر مجبور کردیا مشترکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کیلئے خلیفہ اور سلطان کو متحد ہونا پڑا اور دبیس کے خلاف سلطان محمود سے خلیفہ کو ہر ممکن مدد ملی، مگر جب ۵۱۶ھ ۱۱۲۲ء میں سلطان اور دبیس میں صلح ہوگئی اور

اول الذکر نے اپنے بھائی منصور کو نیک چلنی کی ضمانت مین سلطان کے حوالہ کر دیا تو خلیفہ نے اس مصالحت کو منظور نہ کیا اور سلطان محمود کو لکھا کہ دبیس سے کسی حال مین صلح مناسب نہین، کیونکہ وہ اپنے بھائی کا انتقام لینے کیلئے بغداد پر دست درازی کرنے کا قصد کر رہا تھا خلیفہ نے یہ بھی تحریر کیا کہ آقسنغر برسقی کو موصل سے واپس بلا کر بغداد اور عراق کا شحنہ مقرر کر دیا جائے، خلیفہ اور برسقی کی سپاہ مل کر ایک عرصہ تک دبیس سے لڑتی بھڑتی رہی، آخر ۵۱۶ھ / ۱۱۲۲ء مین ایک کثیر لشکر مہیا کر کے خلیفہ نے اس کو شکست دی، اور بغداد کو مظفر و منصور واپس آیا، عوام پر اس فتح کا اخلاقی اثر بہت گہرا پڑا اور خلیفہ کا کھویا ہوا اقتدار پھر قائم ہو گیا، دبیس سے فارغ ہونے کے بعد شحنہ کی باری آئی آقسنغر سے خلیفہ ناراض ہو گیا تھا چنانچہ اس کو بغداد سے منتقل کرا دیا، ایک اور شخص یرنقش نامی بغداد کا شحنہ مقرر ہوا، مگر اب خلیفہ مسترشد کی بڑھتی ہوئی قوت کب اجازت دیتی تھی کہ وہ بغداد مین کسی شحنہ کی موجودگی گوارا کر سکے مسترشد قابل اور کارگذار آدمی تھا، سلاطین اور دیگر لوگ اس کی عزت کرتے تھے، یہ پہلا خلیفہ تھا جس نے خاندان کے قانونی حقوق کو عملی اختیارات مین تبدیل کرنے کی کوشش کی، ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء مین خطبہ جمعہ کے بعد سلطان محمود سے جنگ شروع کرنے سے پہلے اس نے ایک تقریر کی تھی جس سے اس کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے اس نے کہا ہم نے اپنے معاملات آل سلجوق کو سونپ دیئے تھے، مگر انھون نے ہم سے بغاوت کی، زمانہ نے انھین مہلت دی اور ان کے دل سخت ہو گئے اور ان مین سے اکثر گنہگار تھے۔ ایسے تحکم پسند خلیفہ کے زمانہ مین بغداد پر دو عملی حکومت رہنا خارج از بحث تھا، مواد جودت سے پک رہا تھا، آخر ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء مین پھوٹ پڑا، اور اس نزاع کے سلسلہ مین جو خلیفہ کے وزیر اور

شحنۂ بغداد کے درمیان واقع ہوا، علانیہ جنگ چھڑ گئی شحنہ خلیفہ کی دھمکی سے ڈر کر بغداد چھوڑ گیا
اور سلطان کے پاس پہنچکر شکایت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی گوش گذار کردی کہ خلیفہ کی طاقت
بڑھ رہی ہے اور اگر فوراً مناسب تدارک نہ کیا گیا تو مستقر خلافت سلجوقیون کے ہاتھ سے
نکل جائے گا، اس نصیحت کو سنکر سلطان نے سپاہ فراہم کی اور عراق کی طرف روانہ ہوگیا،
خلیفہ نے احتجاج کیا اور یہ کہکر واپس جانے کی درخواست کی کہ ملک اور اہالیان ملک ویسیں
کی غارتگری سے مفلس ہورہے تھے، اور سلطان کے لشکر کی ضروریات پوری کرنے کے
قابل نہ تھے، اس نے وعدہ کیا کہ اگر بغداد کی آمد اتنے عرصہ تک کیلئے ملتوی کر دیگئی کہ شہر بھی
فارغ البال ہوجائے تو آیندہ سلطان کی آمد مین کسی قسم کی مزاحمت نہ کیجائے گی،

اس عنایت کے معاوضہ مین خلیفہ نے سلطان کو ایک رقم پیش کرنے کا بھی وعدہ کیا جس نے
سلطان کے شکوک اتنے قوی کر دیئے کہ وہ بغداد پہنچنے پر اصرار کرنے لگا، اسکے بعد لڑائی چھڑ گئی
سلطان کے سپاہیون نے خلیفہ کا محل لوٹا اور اس کا تاج چھین کر لے گئے، اس واقعہ نے
لوگون مین ایسا جوش پیدا کر دیا کہ انھون نے دل کھول کر خلیفہ کا ساتھ دیا، اور خلیفہ نے تقریباً
تیس ہزار کا لشکر عظیم فراہم کر لیا لیکن ایک کُردی سردار ٹوٹ کر سلطان سے جا ملا اور واسط
کے حاکم زنگی نے بیچ مین پڑ کر واقعات کا رخ بدل دیا خلیفہ نے آثار مخالف دیکھے تو صلح
کا پیام دیا، سلطان نے منظور کر لیا اور چند تحائف اور کچھ زر نقد پر اکتفا کر کے ۵۲۱ھ ۱۱۲۷ء مین کچھ
عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد بغداد سے واپس چلا گیا،

۵۲۵ھ ۱۱۳۱ء مین سلطان محمود فوت ہوگیا، اس کا بیٹا داؤد، جبال اور آذربیجان مین

سلطان تسلیم کر لیا گیا، مگر اس کے چچا مسعود نے علم بغاوت بلند کر دیا، خلیفہ مسترشد نے اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا، دونون نے خلیفہ سے درخواست کی کہ خطبہ مین نام شامل کر لیا جائے، لیکن جیسا کہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ خلیفہ نے انکار کر دیا اور یہ جواب دیا "خطبہ مین نام شامل کرنے کا فیصلہ سلطان سنجر پر منحصر ہے، وہ جس کو پسند کرے گا اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا" اسی کے ساتھ اس نے سلطان سنجر کو خط لکھدیا کہ کسی کے حق مین سفارش نہ کرے، اس کے بعد بدنظمی کا ایک دور شروع ہوا، سلجوقی خاندان کے مختلف شاہزادے عراق پر تسلط حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے، خلیفہ مسترشد ایک مدعی کو دوسرے سے لڑاتا رہا، وہ شکست خوردہ فریق کی خاطر کرتا تھا، اور اکثر سپاہ اور نقد سے امداد پہنچاتا تھا، اس طرز عمل نے سلطان سنجر کے ساتھ جنگ شروع کرادی، اور تعلقات یہان تک بگڑ گئے کہ ۵۲۶ھ ۱۱۳۱ء مین سلطان نے خطبے سے خلیفہ کا نام خارج کر دیا، آخر سنجر نے حلہ دبیس کو دیدیا، اور اس کو بغداد پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دی، عماد الدین زنگی اور دبیس نے متحدہ طور پر بغداد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی جس کا یہ اثر ہوا کہ خلیفہ جو اس وقت ملک سلجوق شاہ اور مسعود کی معیت مین سنجر کے خلاف ایک فوج کی کمان کر رہا تھا، واپسی پر مجبور ہو گیا، سلجوق شاہ اور مسعود کی متحدہ سپاہ کو سنجر نے شکست دی اور طغرل کو پھر عراق پر مسلط کر دیا، ادھر خلیفہ نے زنگی اور دبیس کے لشکر پراگندہ کر کے مفرور امیدوارون یعنی ملک داؤد اور مسعود کو پھر روپیہ اور سپاہ سے امداد پہنچانا شروع کر دی، ان کے نام خطبے مین شامل کر دیئے اور دو مرتبہ ان کو طغرل

کے خلاف جنگ کرنے کے لئے روانہ کیا، مگر سلطان کے آدمی کی بجائے اپنا امیدوار عراق پر مسلط کرنے مین خلیفہ کامیاب نہ ہو سکا، آخر ۵۲۹ھ ۱۱۳۴ء مین طغرل کا انتقال ہو گیا، اور اب سلطان مسعود کو اس کی جانشینی کا موقعہ مل گیا، مگر مسعود مسندِ حکومت پر پہنچا ہی تھا کہ خلیفہ مسترشد کو عراق کے اس جدید حاکم سے فیصلہ کن جنگ چھیڑنا پڑی، کیونکہ مسترشد سلجوقی اقتدار سے نجات پانے کا عزم کر چکا تھا، اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ کو شکست ہوئی، گرفتار کیا گیا، اور جان سے ہاتھ دھونا پڑے، صورت یہ پیش آئی کہ جب مسعود نے ہمدان پر قبضہ کر لیا تو اس کے چند سرداروں نے بغاوت شروع کر دی، خلیفہ نے حسب معمول باغیون کی ہمت افزائی پر ہی قناعت نہ کی، بلکہ بغداد مین سلطان مسعود کا نام خطبہ سے خارج کر کے صورتِ حال اور زیادہ خراب کر دی، ۵۲۹ھ ۱۱۳۴ء مین جنگ چھڑ گئی، بصرہ کے حاکم نے خلیفہ کو مدد دینے سے انکار کر دیا اور چند اور سردار مسعود سے جا ملے نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سپاہ کو شکست ہوئی اور خود خلیفہ معہ باقیماندہ سرداروں کے اسیر کر لیا گیا، سلطان نے ماہندی کو بغداد کا شحنہ مقرر کیا اور اس نے خلیفہ کی ذاتی املاک ضبط کر لی اور محلسرائے کو تاراج کر ڈالا، اس پر اہالیانِ بغداد سخت رنجیدہ ہوے اور ان کا غم و غصہ اس صورت مین ظاہر ہوا کہ مسجد کا منبر توڑ کر خطیب کو خطبہ پڑھنے سے باز رکھا اور شحنہ کے خلاف جنگ شروع کر دی، اسی اثنار مین ملک شاہ کی بغاوت کی اطلاع پہنچی اور سلطان اسیر خلیفہ کو حراست مین لئے ہوئے اُدھر روانہ ہوا، خلیفہ اور مسعود کے باہم ان شرائط پر مصالحت ہو گئی، کہ خلیفہ کچھ زر نقد سلطان کو پیش کرے سلح سپاہ کبھی جمع نہ کرے، اور محل سے کبھی باہر نہ نکلے، ان شرائط

سے ظاہر ہے کہ خلیفہ کو حکومت مین کوئی حصہ نہ دینے پر سلطان تُلا ہوا تھا، مگر خلیفہ بغداد واپس جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ باطنیہ فرقہ کے چند لوگون نے خیمہ کے اندر اس کو قتل کر دیا قدرتی طور پر اہلِ بغداد کو یہ شکوک پیدا ہوئے کہ یہ قتل سلطان کے ایما سے عمل مین آیا تھا مسترشد کی یہ کوشش کہ سلاطین کی قید سے خود کو رہا کرلے، رسوائی اور ناکامی سے دوچار ہوئی، مگر باوجود اس کے اس نے آزادی کا جذبہ ظاہر کر کے اپنے جانشینون مین ایسی روح پھونکدی کہ ایک کوشش اور عمل مین آنے کے بعد جب کہ سلجوقی سرداراپنی سلطنت کے ٹکڑون پر مصروف پیکار تھے خلفا اپنے مقصد مین کامیاب ہوگئے، مسترشد کا بیٹا راشد مسند خلافت پر بیٹھا تو جنگ کا ازسرِنو آغاز ہوا، راشد نے معاہدہ کی پابندی سے انحراف کیا اور مطلوبہ رقم دینے سے انکار کر دیا محض ایک شبہ پر اس نے شحنہ کو بغداد سے نکال دیا، اور سلطان مسعود کا نام خطبے سے خارج کر دیا، خلیفہ اور سلطان کے باہم جنگ چھیڑ دینے کے لئے اتنا کافی تھا، خلیفہ نے اپنی سپاہ مجتمع کی، اور ملک داؤد بن سلطان محمود سے اتحاد کر لیا، جو ۵۳۰ھ ۱۱۳۵ء مین آذربیجان سے اپنی ساری فوج لے کر بغداد پہنچ گیا، اور اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا، متحدہ قوت کے زعم مین اور مشیرون کی صلاح سے خلیفہ نے مسعود کے پیامِ صلح کو ٹھکرا دیا، حالانکہ سلطان اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ کر رہا تھا، اب مسعود بغداد کی طرف بڑھا، اور پچاس روز تک شہر کا محاصرہ کئے رہا، محاصرہ اٹھانے ہی والا تھا کہ حاکم واسط کے بھیجے ہوئے کچھ جانور پہنچ گئے اور ان کی مدد سے دجلہ عبور کر لیا گیا، خلیفہ اور اس کے حلیف فرار ہو کر موصل مین پناہ گزین ہوگئے اور ۵۳۱ھ ۱۱۳۶ء مین سلطان فاتحانہ مسرت کے ساتھ بغداد مین داخل ہوگیا، اس نے پہلا کام یہ کیا کہ قضاۃ، فقہا، ویگر عمائدینِ حکومت اور سرآوردہ

اہلِ شہر کو جمع کر کے خلیفہ کی وہ تحریر پیش کی جس میں اس نے اعلان کیا تھا کہ اگر کبھی سلطان مسعود سے برسر پیکار ہو تو معزول سمجھا جائے، اس طرح سلطان نے قاضیوں اور فقیہوں سے فتویٰ حاصل کر لیا جس میں رشید کو معزول قرار دیا گیا، سلطان نے یہ فتویٰ مشتہر کرا دیا اور حکم دے دیا کہ اس کا نام خطبے سے خارج کر دیا جائے، آخر میں خلیفۂ معزول کے وزیر سے مشورہ کرنے کے بعد یہ اتفاق یہ طے کیا کہ مقتفی کو (۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء تا ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء) "امیرالمومنین" کی مسند پر متمکن کیا جائے، یہی مقتفی تھا جس نے بعد ہ سلجوقی اقتدار کو شدید صدمہ پہنچایا، ابن اثیر کہتا ہے کہ ایک جائداد کے متعلق جو خلیفہ کی خاندانی ملکیت تھی، سلطان کا قاصد نے خلیفہ کے پاس پہنچا تو اس نے جواب دیا کہ "دجلہ سے پانی لانے کے لئے اسّی خچر استعمال ہوتے ہیں، سلطان کو خیال رکھنا چاہئے کہ جو لوگ یہ پانی پیتے ہیں ان کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں"۔ اس غیر متوقع جواب سے سلطان نے محسوس کیا کہ منصبِ خلافت کے لئے جس شخص کو منتخب کیا گیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ آزاد رائے تھا،

مقتفی اگرچہ سلطان کا ساختہ پرداختہ تھا، مگر اس نے تمام سابق خلفار سے زیادہ خود مختاری کا رویہ اختیار کیا،

سلطان جس وقت بغداد میں مقیم تھا، مقتفی نے اس کے قتل کے لئے سازش کی مگر بارش کی کثرت نے سلطان کو اس روز نماز کے لئے محل سے نکلنے نہ دیا، اور سازش کامیاب نہ ہوئی، خلیفہ کی خوش قسمتی سے ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء میں سلطان مسعود کا انتقال ہو گیا، اس کی موت کے بعد بغداد اور نواحِ بغداد سے سلجوقیوں کا اثر ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا، بغداد

کا شحنہ یعنی رند مشرب مسعود البلالی فرار ہو گیا اور جو سلجوقی سردار شہر مین مقیم تھے مقتفی نے ان کے مسکن لوٹنا شروع کر دیئے، خلیفہ نے مسند پر بیٹھتے وقت جو قسم کھائی تھی اس کے مطابق تمام ترکی اور ایرانی سردار جن کا سلجوقیون سے تعلق تھا شہر بدر کر دیئے گئے اور ان کی بجائے یونانی اور آرمینی مملوک مقرر ہوئے، سلطان کے وزیر جس علاقہ پر قابض تھے وہ اب وزیر خلافت کو منتقل کر دیا گیا، اسی سال خلیفہ نے حلہ، نابلس، تکریت اور کوفہ تک عراق پر قبضہ کر لیا، ملک شاہ نے کچھ فوج بھیجی، مگر بغداد کے لشکر نے اس کو پسپا کر دیا اور آخر الذکر دو مقامات پر خلیفہ کی براہ راست حکومت قائم ہو گئی،

بغداد اور اردگرد کے صوبون پر حکومت حاصل ہونے کے بعد، سلطان کا نام بغداد کے خطبون مین داخل رکھنا خلیفہ کو باعث ننگ اور محکومی کی دلیل معلوم ہوا، چونکہ بغداد مین ان کے حق مین محض اس لئے دعا کیجاتی تھی کہ وہ حاکم واقعی تھے لہذا جب وہ حکومت ختم ہو گئی تو ان کا نام خطبہ مین شامل نہ رہ سکتا تھا، مگر سلطان اس استدلال کو بغیر ایک اعلان جنگ کے قبول کرنے والا تھا، تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اب بھی سلطان کا نام خطبہ مین شامل کرنے کے لئے تیار تھا، جب تک سنجر ذی اختیار حاکم رہا اس کا نام خطبہ مین پڑھا جاتا تھا، اور بغداد کے سکون پر مضروب ہوتا تھا، ۵۵۱ھ ۱۱۵۶ء مین جب سنجر غزون سے شکست کھا کر بغداد آیا اور سلیمان شاہ بن محمد کو اپنا ولیعہد نامزد کیا تو خلیفہ نے سلیمان شاہ کو بھی اس عزت سے سرفراز کیا، مگر اس کے برعکس جب محمد نے جو عراق عجم مین حاکم ہو گیا تھا، اپنا نام خطبہ مین پڑھے جانے کی درخواست کی تو خلیفہ نے انکار کر دیا، سلطان محمد

کو یہ بہانہ مل گیا اور بغداد کا محاصرہ شروع کر دیا، مگر ہوشیار خلیفہ حملہ کے لئے بالکل تیار تھا، سلطان نے بے ضرورت محاصرہ کو طول دیا، حالانکہ متواتر اس کے پاس جہازون کی کمک پہنچ رہی تھی، کسی مصلحت سے وہ برابر خلیفہ کو پیام بھیجتا رہا کہ میرے حقوق اگر تسلیم کرلئے جائین تو مین اب بھی اطاعت سے باہر نہین ہون، یہ تنقیح فیصل ہونا مشکل ہے کہ اس کا سبب کیا تھا، یا تو سلطان کا مقصد ہی یہ تھا کہ خطبہ مین نام داخل ہونے کا حق تسلیم کرلیا جائے، یا یہ ہوگا کہ محاصرہ کرنے والی سپاہ مین بعض کو خلیفہ اور دار الخلافہ کے خلاف تلوار اٹھانے مین تامل معلوم ہوتا تھا، اسی دوران مین خلیفہ کا وزیر سلطان کے افسرون کو خفیہ طور پر نقد نذرانے پہنچا رہا تھا، اور ان کے ساتھ یہ تہدید ہوتی تھی کہ خلیفہ سے بغاوت کرنا یا بغداد پر حملہ آور ہونا احکام دین سے خلاف ورزی کرنا ہے، کسی حد تک وزیر کی تبلیغ کامیاب ہوئی، لیکن اصل امداد کسی اور طرف سے ملی، جب تک سلطان حملے کے لئے پوری طرح تیار ہوا، خلیفہ اور وزیر کی مدبرانہ ریشہ دوانیان یون رنگ لے آئین کہ ملک شاہ اور سلجوقی تخت کے دوسرے مدعی سلطان محمد کے خلاف لشکر کشی کرنے اور اس کے حربی مرکز ہمدان پر حملہ آور ہونے کے لئے آمادہ ہوگئے، اب اندیشہ تھا کہ گھر ہی مین فتنہ نہ پیدا ہو جائے، چنانچہ محاصرہ ختم کر دیا گیا اور بغداد بچ گیا، اس کے بعد کسی سلجوقی فرمانروا نے بزور شمشیر دار الخلافہ پر اپنا حق جتانے کی کوشش نہ کی،

سلطان محمد بن محمود بن ملک شاہ ۵۵۴ھ ۱۱۵۹ء مین فوت ہوگیا، اس کے بعد سلیمان شاہ ابن محمد سلطان ہوگیا، چونکہ سلیمان کو پہلے ہی خلیفہ نے سنجر کا جانشین تسلیم کرکے اس کا نام خطبہ مین

داخل کر دیا تھا، اس لئے کوئی نزاع نہ پیدا ہوا، لیکن ملک شاہ نے اصفہان میں کچھ جمعیت فراہم کر لی اور خلیفہ سے اپنا نام داخلِ خطبہ کرنے کا مطالبہ کیا، اسی کے ساتھ یہ دھمکی دی کہ خلیفہ اگر انکار کرے گا تو بغداد پر حملہ کر دیا جائے گا، ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء میں خلیفہ کے وزیر نے ملک شاہ کی خدمت میں ایک کنیز اس مقصد سے روانہ کی کہ زہر دے کر اس کا کام تمام کر دے، سلیمان شاہ کو جو عیش و عشرت میں مبتلا ہو گیا تھا، خود اس کے وزیر شرف الدین نے قتل کر دیا، اور اس کے بعد بغداد میں سلجوقی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اس کے جانشین ارسلان شاہ ابن طغرل (۵۵۶ھ / ۱۱۶۱ء تا ۵۷۳ھ / ۱۱۷۷ء) کا قاصد اس درخواست کے ساتھ کہ ارسلان شاہ کے نام پر خطبہ پڑھا جائے، بغداد پہنچا مگر نکال دیا گیا، آخری سلجوقی سلطان یعنی طغرل نے بغداد پر حکومت قائم کرنے کی پھر کوشش کی، مگر اس کوشش نے اس کو خلیفہ ناصر سے جو سب سے زیادہ عملی آدمی تھا دست و گریبان کر دیا، اور آخر خلیفہ نے ۵۹۰ھ میں طغرل کا سر اپنے محل کے دروازے پر لٹکا ہوا دیکھ لیا،

بغداد پر فرمانروا رہنے کی اس طویل جنگ میں خلیفہ آخر کامیاب ہوئے، اب بغداد میں خلفاء کی ایک خود مختار ریاست قائم ہو گئی، جہاں ان کو مذہبی اور سیاسی دونوں اختیار حاصل تھے، یہ مختصر سلطنت اُن کے مذہبی اقتدار سے نہیں بلکہ بزورِ شمشیر وجود میں آئی، اس میں شک نہیں کہ عوام کی ہمدردی سلطان سے زیادہ خلیفہ کے ساتھ رہتی تھی چنانچہ اکثر سپاہی اور ان کے افسر اس لشکر سے مقابل ہوتے جھجکتے تھے، جو بذاتِ خود خلیفہ کی سرکردگی میں ہوتا تھا، مگر یہ اسباب اتنے قوی نہ تھے کہ نااہل خلفاء کو اپنا اقتدار

قائم کرنے مین کامیاب بنا سکتے، ان کی کامیابی ایک طرف تو ان مسلسل لڑائیون کی رہینِ منت تھی جو سلجوقیون مین تاج وتخت کی خاطر جاری رہین اور دوسری طرف اس واقعے کا نتیجہ تھی کہ اسی زمانے مین پے در پے حوصلہ مند اور طاقتور خلفاء مسندِ خلافت پر متمکن رہے،

اس کے برخلاف ایران مین خلیفہ کا سیاسی اثر سلجوقی عہد مین بالکل معدوم ہو گیا، خلیفہ نے تمام سیاسی اختیارات سلطان کو تفویض کر دیئے تھے، اور سلطان مجاز تھا کہ اپنی سلطنت کا جو ٹکڑا چاہے کسی کو سپرد کر دے، لہذا خلیفہ کو ایران کے دوسرے والیانِ حکومت سے کوئی سروکار نہ رہا، پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ۴۳۲ھ/۱۰۴۰ء مین طغرل اور اسکے بھائیون نے خلیفہ کی خدمت مین مراسلت بھیجنے کے بعد ہی اپنی سلطنت باہم تقسیم کر ڈالی تھی، قاورد بن چغری بیگ کے حصہ مین کرمان کی حکومت آئی، طغرل کو جب سلطان تسلیم کر لیا گیا تو کرمانی سلجوق خودمختار ہو گئے، وہ نہ خلیفہ کی پروا کرتے تھے نہ سلجوقی سلاطین کی، بلکہ آخرالذکر کے ساتھ وہ اکثر برسرپیکار رہتے تھے، ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء مین قاورد نے ملک شاہ کے مقابل مین وراثت کا دعویٰ کیا، اس نے شکست کھائی، گرفتار ہوا اور ملک شاہ کے حکم سے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا، مگر اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان شاہ جو باپ کے ساتھ ملک شاہ کی قید مین تھا کسی صورت سے فرار ہو کر کرمان پہنچ گیا، اور وہان جا کر ۴۶۷ھ/۱۰۷۴ء مین ملک کا لقب اختیار کر لیا، اس سے فرمانروائی کی سند حاصل کرنے کے لئے سلطان یا خلیفہ کسی سے درخواست کرنے کی زحمت

بھی نہ اٹھائی، ۴۷۲ھ ۱۰۷۹ء مین ملک شاہ نے کرمان پر چڑھائی کر دی، مگر سلطان شاہ نے جو اس کا بھتیجا تھا، اطاعت قبول کر لی، بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور بیش بہا تحفے نذر مین پیش کئے، لہذا ملک شاہ نے سلطان شاہ کو اس تمام صوبے کا جو اس کے زیر نگین تھا، حاکم مقرر کر دیا، چونکہ کرمانی ملوک کو براہ راست خلیفہ سے کبھی فرمان نہین ملا، اس لئے خلافت سے انھین کوئی واسطہ نہ رہا،

ان کے ہان بھی تاج و تخت کی خاطر لڑائیان ہوئین جو کبھی شروع ہو جاتی تھین کبھی بند، مگر ایک دوسرے کے مقابل اپنے دعاوی کو تقویت دینے کے لئے بھی کرمانی شہزادون نے کبھی خلیفہ سے رجوع نہ کیا، معلوم ہوتا ہے کہ انکی حکومت محض تلوار کے بل پر قائم رہی،

جب سے فرمانِ حکومت کی تجدید ہونے کا دستور ختم ہوا، خراسان بھی سیاسی حیثیت سے خلافت سے منقطع ہو گیا، سنجر کو سندِ حکومت ملنے کے بعد خلیفہ کی وفات پر بھی کبھی اس کی تجدید نہ کی گئی، معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ یا والیِ ملک کی وفات پر ان فرامین کی تجدید اسی حالت مین ضروری سمجھی جاتی تھی جب کہ سلطان خود بغداد پر حکمران ہو، خراسان کا واسطہ خلافت کے ساتھ جو کچھ قائم رہا وہ محض اس وجہ سے کہ خراسان کا فرمانروا خلیفہ کا تسلیم کیا ہوا سلطان تھا اور اس حیثیت سے اس کو مرکزی حکومت سے تعلقات رکھنا پڑتے تھے، تاہم مہماتِ ملکی کے متعلق خلیفہ اور مختلف والیانِ ملک کے باہمی رسل و رسائل کا قلیل مواد ان حکمرانون کی خود مختاری کا ثبوت دیتا ہے، ۵۴۹ھ ۱۱۵۴ء مین جبکہ سلطان سنجر اسیر رہا ملک سلیمان شاہ اور محمود خان بن محمد بن بغراخان یکے بعد دیگرے اس کے

جانشین ہوئے، لیکن ان مین سے کسی نے خلیفہ سے فرمانِ حکومت کی استدعا نہین کی،
۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء مین سنجر کے انتقال کے بعد بھی محمود خان نے جو آخر کار سنجر کی وصیت کے مطابق
سلطان قرار دیا گیا، خلیفہ سے تجدید فرمان نہ چاہی، محمود خان کی تخت نشینی اور سلطانی
صرف ایک وصیت پر مبنی معلوم ہوتی ہے،

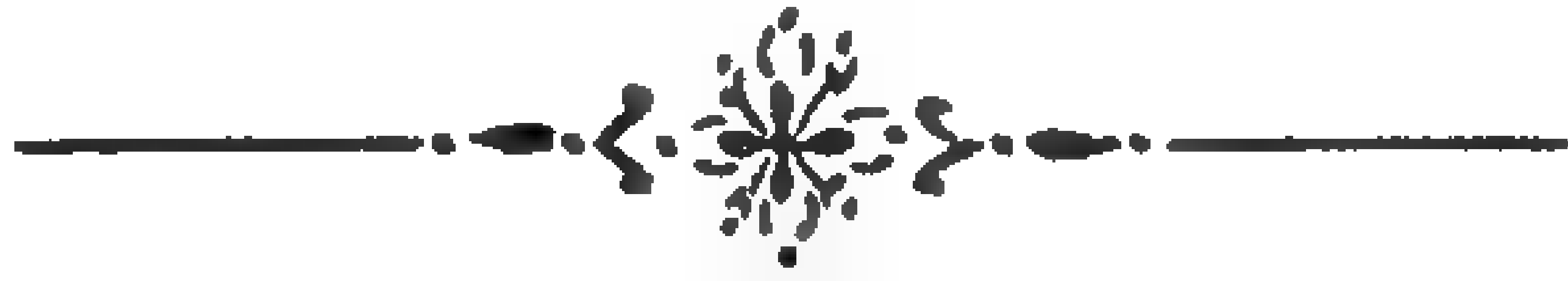
ایران مین جو مختلف صوبہ دار تھے ان کا تقرر سلجوقی سلاطین کے حکم سے ہوتا تھا، یہ
صوبہ دار یا تو نمایشی اطاعت کا اظہار کرتے رہے یا موقعہ پانے پر آزاد ہو گئے، یہ واقعہ ہے
کہ ان حکمرانون کے متعلقہ علاقون مین خطبہ مین بھی خلیفہ کا نام پڑھا جاتا تھا اور سکون پر بھی
مضروب ہوتا تھا، مگر یہ اعتراف اطاعت ایک قدیم دستور کی حیثیت رکھتا تھا، اس کے
ساتھ نہ تو حکمران صوبہ دارون کی طرف سے وفاداری کا کوئی رسمی اظہار کیا جاتا تھا اور نہ
خلیفہ کی طرف سے اس کے معاوضہ مین کوئی فرمان یا سندِ حکومت عنایت ہوتی تھی،
اس دستور کا باقی رہنا محض ایک شرعی رسم کی حیثیت رکھتا تھا، اور جس کے یہ معنی ہین کہ
اس زمانے مین ایران کے حکمران عباسی خلافت کو سیاسی حیثیت سے تسلیم کرنا مذہبی
حیثیت سے تسلیم کرنے کے مترادف نہ سمجھتے تھے،

حاصل کلام یہ ہے کہ سلجوقی عہد مین جہان تک عباسی خلافت کا تعلق ہے، دو
خصوصیات نمایان نظر آتی ہین، اول یہ کہ مختلف حکمرانون کے حق مین سندِ حکومت کی
تجدید ہونے کا دستور اس زمانے مین رفتہ رفتہ ختم ہو گیا، اب تجدید کی ضرورت صرف اس
وقت محسوس کی جاتی تھی جب کہ حکومت ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان

ین جاتی تھی، ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد کو منتقل ہوتے وقت، جدید سند حکومت درکار نہ ہوتی تھی، اس طرح خلافت کو ایران سے کوئی سیاسی واسطہ نہ رہا، اور دورِ سابق ین جتنا اقتدار باقی رہ گیا تھا، وہ بھی ختم ہوگیا۔

سلجوقی عہد کی دوسری خصوصیت مگر سب سے زیادہ اہم خصوصیت یہ تھی کہ خلافت کے مذہبی اور دنیوی اختیارات کے درمیان حدِ فاصل قائم ہوگئی، تاریخ ین پہلی مرتبہ خلیفہ نے بہ طیبِ خاطر اپنے سیاسی اختیارات سلطان کو تفویض کر دیئے، اور آیندہ سے خلافت کے سیاسی کاروبار کا اعلیٰ منتظم سلطان سمجھا جانے لگا، سیاسی اختیار سلطان کو سپرد ہو جانے کا ہی نتیجہ تھا کہ آخری سلجوقی سلطان کے اتابیگ نے کہا کہ "امام کی حیثیت سے خلیفہ کو نماز اور دینی قیادت سے سروکار رکھنا چاہیئے کیونکہ یہی چیزین ایمان اور نکوکاری کی بنیاد ہین، ان کے علاوہ جہانتک سیاسی معاملات کا تعلق ہے وہ سب سلطان کو سپرد کر دینا چاہیئین"۔ یہ خیالات مبالغہ پر مبنی نہین، بلکہ حقیقی صورتِ حال کے مظہر ہین اس کے برخلاف جس وقت کوئی قابل اور طاقتور شخص سریرِ خلافت پر پہنچ جاتا تھا تو قدرتی طور پر وہ سلطان کی حیثیت کو تسلیم نہ کرتا تھا، بلکہ قدیم اختیارات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، چنانچہ سلجوقی عہد مین آخری تین خلفاء کا عمل یہی رہا، لیکن اس سے انکار نہین کیا جاسکتا کہ ایک جدید صورت وقوع مین آگئی تھی، اور شرعی فتویٰ جو کسی حد تک حالاتِ وقت پر مبنی تھا اس پر مہرِ جواز لگا چکا تھا، سلطان اگر طاقتور ہوتا اور اپنے حقوق طلب کرنے کی قوت اس مین ہوتی تو خلیفہ کو بجز اس کے چارہ نہ تھا کہ سیاسی اختیار اس کے

سپرد کر دے، پھر سلطان ان اختیارات کو ایک مرتبہ حاصل کرنے کے بعد پورے قانونی حق اور تمام اس استحکام کے ساتھ جو ماضی کی نظیر سے حاصل ہوتا ہے، ہمیشہ ان اختیارات کا حامل رہ سکتا تھا، اس نظیر ہی کی بناء پر خوارزم شاہی سلاطین نے ان حقوق کا دعویٰ کیا جو پہلے سلجوقیون کو حاصل تھے، اور خلافت سے مسلسل برسرپیکار رہے، یہان تک کہ دونون برباد ہو گئے، اگلے باب مین اس کی تفصیل عرض کیجائے گی،



آٹھواں باب

خلافت کے آخری ایام

خلافت اور خوارزم شاہی

خوارزم شاہی ایران میں عروج کو پہنچے تو ارتقائے سلطنت کی آخری منزل بھی طے ہو گئی، وہ درمیانی قوت جس نے ان کو حکومت بخشی تھی، جب فنا ہو گئی تو انھوں نے خلیفہ سے سندِ حکومت کی درخواست بھی نہ کی، اس دستور کو شکست کرنے والے سب سے پہلے خوارزمی ہی ہوئے، اتسز کے بیٹے ارسلان نے (۵۵۱ھ ۱۱۵۶ء - ۵۶۲ھ ۱۱۶۷ء) جو باپ کی جگہ حکمران ہوا، سلطان سنجر سے جب کہ وہ ۵۵۱ھ ۱۱۵۶ء میں غزوں کی اسیری سے رہا ہو گیا تھا، فرمانِ حکومت حاصل کر لیا تھا، سنجر ۵۵۲ھ ۱۱۵۷ء میں انتقال کر گیا، مگر اس کے بعد ارسلان نے نہ تو خلیفہ سے درخواست کی کہ اس کی حکومت پر قانونی جواز کی مہر ثبت کر دے، اور نہ محمود سے جو عراق میں اس وقت سلجوقیوں کا سرخیل تھا، فرمان کا خواستگار ہوا، اس بنا پر کہ ارسلان اپنے ملک پر حکمرانی کرنے کی اجازت سلطان

سنجر سے حاصل کر چکا تھا، اس کو جائز فرمانروا تسلیم کیا جا سکتا ہے، مگر ۵۶۸ھ (۱۱۷۲ع) مین اس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے بیٹے تکش اور سلطان شاہ تخت کے لیئے برسرپیکار رہے، اور انھون نے خلیفہ کی سند سے اپنے حقوق مستحکم کرنے کا خیال نہ کیا، بجائے خلیفہ کی اخلاقی اور واقعی اعانت حاصل کرنے کے انھون نے ایک کافر یعنی قراخطائیہ سے مدد کی درخواست کی، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت خلیفہ کی سند بھی کچھ وقعت نہ رکھتی تھی، اور حقوق کا تصفیہ صرف تلوار کی دھار سے ہوتا تھا،

اسی طرح غوری جو ایران مین خوارزمیون کے رقیب تھے اور اس بنا پر خلافت کے ساتھ دوستانہ عمل رکھتے تھے، زمانہ کے ساتھ چلے اور انھون نے اقتدارِ خلافت کو صرف اس حد تک تسلیم کیا کہ خطبون مین اور سکّون پر خلیفہ کا نام درج کرتے رہے، کوئی تاریخی شہادت نہین بتاتی کہ انھون نے سندِ حکومت کی استدعا خلیفہ کے حضور مین کبھی پیش کی اور باوجود اس کے کہ ان کو سلطان کا لقب کبھی نہین دیا گیا، انھون نے خود اس خطاب کو اختیار کر لیا، جیسا کہ سکّون سے ظاہر ہوتا ہے، یہ تو واقعہ ہے کہ ان کے اور خلیفہ کے درمیان قاصدون کی آمد و رفت اکثر رہی اور کئی مرتبہ خلیفہ کی طرف سے خلعتِ فاخرہ عنایت ہوئے، مگر خلیفہ کا التفات صرف اس لئے تھا کہ وہ اپنی حیثیت پر قانع تھے اور یہ مطالبہ نہ کرتے تھے کہ بغداد کے خطبون مین نام شامل کیا جائے یا سلطانی کا لقب بخش دیا جائے، چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہین کہ اس وقت ایران مین جتنے حکمران تھے ان مین کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو حکومت کا حق خلیفہ کی

طرف سے تفویض کیا گیا ہو، یہانتک کہ زمانہ کے امتداد سے رفتہ رفتہ سلاطین کو اپنی حکومت کے جواز اور شرعی اداروں کے حق قیام کے لئے خلیفہ سے سند فرمان لینے کا طریقہ ختم ہو گیا،

یہ سلاطین جن کے پاس خلیفہ کی دی ہوئی کوئی سند حکومت نہ تھی، قضاۃ اور دوسرے شرعی عہدہ داروں کا تقرر کرتے تھے، اوران تمام تقررات کے جائز یا ناجائز ہونے سے کوئی بحث نہ کرتا تھا، حالانکہ امام غزالی کے عہد مین فقہا نے اس پر بہت کچھ جرح و قدح کی تھی، ہم اب بھی دیکھتے ہین کہ خلفا ان سلاطین کو خلعت سلطانی سے نوازتے ہین، مگر سلاطین اس خلعت کی وقعت نہین کرتے بلکہ بعض اوقات جب کہ انھین اپنی مرضی پوری ہوتی نظر نہین آتی وہ خلعت قبول بھی نہین کرتے، اس کے برخلاف کبھی کبھی خلعت ملنے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، اور عوام کو دکھایا جاتا ہے کہ خلیفہ نے ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سلاطین خلیفہ سے بے نیاز ہو چکے تھے اور اپنی اپنی قلمرو مین اندر صرف سیاسی اختیارہی نہین بلکہ مذہبی قیادت کے منصب پر بھی قابض تھے، وہ اس پر بھی قانع نہ تھے، بلکہ بغداد مین خلافت پر بھی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے، مگر اب خلیفہ بھی اپنی کھوئی ہوئی قوت کسی حد تک پھر حاصل کر چکے تھے، اور صرف یہی نہین کہ وہ سلاطین کے مطالبے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، بلکہ اپنی حکومت کے حدود ہر ممکن صورت سے وسیع کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ اور سلطان کے درمیان رقابت شروع ہو گئی،

خلیفہ ناصر جب تکش کی مدد سے آخری سلجوقی سلطان کا قصہ پاک کر چکا تو اس کو محسوس ہوا کہ تکش سلجوقیوں کے زوال پذیر خاندان سے کہیں زیادہ خطرناک حریف ثابت ہوگا، اب اسکو معلوم ہوا کہ عراق عجم پر قبضہ پانے میں سخت مزاحمت کی جائے گی طغرل کو شکست دے کر تکش نے ہمدان پر متصرف ہونے کی کوشش کی، خلیفہ کو اطلاع ہوئی تو وزیر کو خلعتِ سلطانی اور بیش قیمت تحائف لے کر روانہ کیا اور یہ ہدایت کردی کہ تکش سے سمجھوتہ کر لیا جائے، ممکن تھا کہ سلطان اور خلیفہ کے باہم تصفیہ ہو جاتا، لیکن وزیر نے اپنے شرائط کچھ ایسے پُرنخوت الفاظ میں پیش کئے کہ سلطان قبول نہ کر سکا، وزیر کا مطالبہ تھا کہ سلطان کو خلیفہ سے ملاقات کرنے کے لئے گھوڑے سے اتر کر خود پیشقدمی کرنا چاہیئے اس لئے کہ سلطان کا تاج و تخت دیوانِ عالی یعنی حکومت بغداد کا عطیہ ہے، ان دعاوی کو حیلہ جوئی پر محمول کیا گیا اور سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا، اور اگر وزیر عجلت کے ساتھ واپس نہ ہو جاتا تو اس موقعہ پر جنگ کی نوبت آجاتی، تو مفتوحہ ممالک کی حکومت مختلف شخصوں کو سپرد کر دینے کے بعد تکش خوارزم کی طرف مراجعت کر گیا، لیکن وزیر کے غیر مصالحانہ طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ اور سلطان کے باہم بہت جلد چھڑ گئی، ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء میں وزیر نے جو برابر حدودِ خلافت کو وسعت دیتا رہا تھا، ہمدان کو فتح کر لیا۔ تکش کے مرسلہ قاصد کو اس نے بے رخی کے ساتھ واپس کر دیا، کیونکہ وہ کسی مصالحت کے لئے تیار نہ تھا، تاوقتیکہ کل عراق عجم حوالہ نہ کر دیا جاتا، مجبوراً سلطان کو خلیفہ کی سپاہ سے نبرد آزما ہونا پڑا، خلیفہ کا لشکر منتشر ہو گیا، اور سلطان نے پھر ہمدان پر قبضہ کر لیا، وزیر اس

اثنا میں انتقال کر چکا تھا، جوشِ نفرت میں اس کی نعش قبر سے اکھاڑ ڈالی گئی، اور سر کاٹکر خوارزم بھیجدیا گیا، سلطان ابھی ہمدان ہی مین مقیم تھا کہ شافعی فقیہ مجیر الدین ابوالقاسم محمود ابن المبارک البغدادی خلیفہ کی طرف سے پیغام لے کر بھیجے گئے، کہ باپ دادا کی سلطنت پر قانع رہے، اور جدید فتوحات سے دست بردار ہوجائے، ورنہ اس کے اخراج کی کارروائی شروع کیجائے گی، سلطان نے خلیفہ کے مطالبہ کا جواب یہ دیا کہ خوزستان کے صوبے کا مزید مطالبہ شروع کردیا، قاصد مایوس ہو کر واپس آیا، مگر سردست حالات اپنی جگہ پر قرار رہے، ۵۹۴ھ ۱۱۹۸ء مین تکش نے آخر خلیفہ سے باقاعدہ درخواست کی کہ اسکو سلطانی کا منصب عنایت کیا جائے، اور بغداد کے خطبون مین اس کا نام داخل ہو، یہ مطالبہ بغداد کی حکومت مانگنے کے ہم معنی تو نہ تھا مگر اس مین شک نہین کہ حکومت کا پیش خیمہ ضرور تھا، خلیفہ اپنے آبا کے تلخ تجربات دیکھنے کے بعد سلطانی کا منصب از سرنو زندہ کرنے کو تیار نہ تھا، چنانچہ بغداد پر تسلط ہو جانے کا خطرہ دور کرنے کے لئے اس نے غوریون کو ترغیب دی کہ خوارزم شاہ سے جنگ کر کے اس کے مقبوضات چھین لین، قراخطائیہ کو جو تکش کے حلیف تھے غوریون کے ہاتھون شکستِ فاش نصیب نہ ہوتی تو تکش خلیفہ سے صلح کرنے کو بھی آمادہ نہ ہوتا، آخر نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ اور سلطان کے مابین سمجھوتہ ہو گیا، ۵۹۵ھ ۱۱۹۹ء مین تکش اور اس کے بیٹے قطب الدین محمد کو خلعتِ سلطانی خلیفہ نے عنایت فرمایا، اس صورت سے برائے چندے اس مطالبہ کو رد کرنے مین خلیفہ کامیاب ہو گیا، مگر تکش کے بیٹے محمد نے کچھ عرصہ کے بعد اس سوال کو اور بھی زیادہ

شدت کے ساتھ دہرادیا،

محمد جس وقت رقیبون سے نجات پاچکا، اور مشرق کے مسلم حکمرانون مین ایک نمایان حیثیت کا مالک ہوگیا، وہ ایک عالمگیر سلطنت کا خواب دیکھنے لگا، اور سکندر ثانی کا لقب اور سلطان سنجر کا نام اختیار کر لیا، اس کی مہر پر ظل اللہ فی الارض کے الفاظ اس سے پہلے ہی کندہ ہو چکے تھے، اب اس نے خلافت کی طرف توجہ شروع کی تاکہ خود بغداد پر بحیثیت سلطان کے حقوق قائم کر سکے، اگرچہ خوارزم شاہ کو خلیفہ سے بہت ہی شکایات تھین، لیکن اس امر مین شبہہ کی گنجایش نہین کہ خلافت سے شمشیر آزما ہونے کا اصل سبب صرف یہ خواہش تھی کہ بغداد مین وہی اقتدار حاصل کرلے جو اس سے پہلے سلجوقیون کو نصیب تھا، وہ خود کو آل بویہ سے برتر اور سلجوقیون کا ہم مرتبہ خیال کرتا تھا اور اس لئے خلیفہ کی قلمرو مین وہی اختیارات لینا چاہتا تھا، جو ان دو خاندانون کا حصہ رہ چکے تھے، محمد نے تدبیر سے اپنا مقصد پورا کرنا چاہا، اور قاضی مجیرالدین بن عمر بن سعد کو خلیفہ کی خدمت مین یہ استدعا لے کر روانہ کیا کہ اس کا نام بغداد کے خطبون مین شامل کردیا جائے، کسی حد تک محمد کا یہ مطالبہ حق بجانب تھا، کیونکہ سلطان سنجر پہلے مثال قائم کر گیا تھا، مگر وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس درخواست کو اسی طرح رد کردیا جائے گا، جس طرح اس کے باپ کی خواہش کو ٹھکرا دیا گیا تھا، جیسی کہ توقع تھی، خلیفہ نے قاضی کے دلائل پر التفات نہ کیا اور اس کو بتایا کہ جب خلیفہ نے مجبور ہو کر طغرل بیگ سلجوقی کو یہ امتیاز عنایت کیا تھا تو صورتِ حال کیا تھی، خود خلیفہ

نے شیخ شہاب الدین کو خوارزم شاہ کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا کہ اس مطالبہ
پر اصرار نہ کیا جائے، خلیفہ کے سفیر کو بجا اعزاز کے ساتھ لیا گیا اور جب اس نے
ایک حدیث اس مضمون کی سنائی کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مومنین کو خاندان
عباسیہ کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا ہے تو سلطان ادب سے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا، اور
جواب میں کہا کہ "اگرچہ میں ترکی النسل ہوں اور عربی زبان بہت کم جانتا ہوں تاہم آپکی
حدیث کا مفہوم میری سمجھ میں آگیا، میں نے بنو عباس کے کسی فرد کو نہ ضرر پہنچایا ہے، نہ
اس کے ساتھ برائی کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے برخلاف میں سنتا ہوں کہ بنو عباس
کی خاصی تعداد امیر المومنین کے قیدخانوں میں محبوس رہتی ہے، اگر شیخ اس حدیث
کو امیر المومنین کے سامنے پڑھتا تو زیادہ مناسب اور مفید ہوتا" شیخ نے خلیفہ کے
طرزِ عمل کو یہ کہکر ثابت کرنا چاہا کہ افراد کو کل ملتِ اسلامیہ کا مفاد مدِ نظر رکھتے ہوئے
محبوس کیا جاتا تھا، مگر سفارت کا مقصد ناکام رہا، اور خلیفہ اور سلطان کی عداوت
اور زیادہ ہوگئی، جوینی کے بقول سلطان اس الزام سے بچنا چاہتا تھا کہ اس نے
امام کے خلاف جس کی اطاعت اسلام کے ارکان میں شامل ہے تلوار اٹھائی ہی،
لہذا وہ خطبہ کے سوال سے زیادہ معقول حیلۂ جنگ ڈھونڈنا چاہتا تھا، خلیفہ ناصر کے
بے اصول طرزِ عمل سے جو سلطان کے ساتھ اختیار کیا گیا، یہ دیرینہ آرزو پوری کرنے
کا موقعہ مل گیا، خوارزمیوں کی مذہب پرستی دیکھتے ہوئے خلیفہ ہمیشہ ان کو اپنا رقیب
تصور کرتا تھا اور غوریہ کو ان کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا، حتی کہ قراخطائیہ سے ساز

کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، خلیفہ کی بدقسمتی سے خوارزم شاہ جب ۶۱۲ھ ۱۲۱۵ء مین ہرات مین داخل ہوا تو یہ تمام مکتوب اس کے ہاتھ لگ گئے، ان تحریرون کو محمد نے عام کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ راز بھی افشا کر دیا، کہ اغلمش کا قتل جو محمد کی طرف سے عراق کا حاکم اور اس وقت امیر مکہ تھا، کیونکر خلیفہ کی غدارانہ ترغیب سے عمل مین آیا تھا، اس طرح اپنی مملکت کے علما، سے فتویٰ حاصل کرنے مین وہ کامیاب ہوگیا کہ وہ امام جو ایسی ناشائستہ اور ناپسندیدہ افعال کا مرتکب ہوا ہے مسندِ امامت کے لائق نہین ہے، اور وہ سلطان جو اسلام کا حامی ہو اور دین کی خاطر جنگ کرنے مین اپنی زندگی گذار رہا ہو حق رکھتا ہے کہ ایسے امام کو معزول کرکے دوسرے کو نصب کر دے، علاوہ ازین اس فتوے نے یہ بھی اعلان کر دیا کہ عباسیون نے خلافت پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا، اور اس کے جائز حقدار فرزندانِ علی تھے، اس فتوے کی بنا پر سلطان نے خلیفہ ناصر کی معزولی کا اعلان کر دیا، سکہ اور خطبہ سے اس کا نام خارج کرا دیا، اور سید علاء الملک ترمذی کی خلافت کا اعلان کر دیا، یہ انتہائی کارروائی عمل مین لانے کے لئے تیار ہوکر ۶۱۴ھ ۱۲۱۷ء مین خوارزم شاہ بغداد پر حملہ آور ہوا، سلطان کی بدقسمتی سے وہ لشکر جو خود سلطان کی سرکردگی مین ہمدان سے بغداد جا رہا تھا، کردستان کے پہاڑون مین برف باری کا شکار ہوکر برباد ہوگیا، جو بچے تھے ان کو کردیون نے فنا کر دیا، چنانچہ وہ تعداد جو خوارزم واپس پہنچی بہت ہی مختصر تھی، اس شکست نے محمد کا وقار برباد کر دیا، خصوصاً اس سبب سے کہ اس کی تباہی کو ایک سزا سمجھا گیا جو خدا کی طرف سے اس معصیت کا رہم کے عوض دی گئی تھی،

نسوی کے بقول اس ناکامی کے بعد محمد نے پشیمانی کا اظہار کیا اور حکومت بغداد سے مصالحت کر لینے کی کوشش شروع کر دی، مگر ابن اثیر کہتا ہے کہ اس نے خلافت کے ساتھ اپنا نزاع قائم رکھا، اور جس وقت وہ ایک متوقع حملہ روکنے کے لئے خوارزمیہ کو واپس آرہا تھا، تو اثنائے راہ مین اس نے یہ مشہور کیا کہ خلیفہ کی وفات ہو گئی اور مختلف مقامات پر خطبون مین سے اس کا نام خارج کرا دیا،

محمد کی یہ کارروائی وہ منزل تھی جب کہ سلاطین کا ادعائے سیادت اور خلیفہ کو بندۂ فرمان بنا لینے کی کوشش اپنی انتہائی حد تک پہنچ گئی، خوارزم شاہ کا اس مقصد مین ناکام رہنا متعدد اسباب کا نتیجہ تھا سب سے زیادہ مہلک اور غیر دانشمندانہ غلطی جو اس سے سرزد ہوئی یہ تھی کہ ایک شیعی مذہب کی امامت کا اعلان کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف عباسی خاندان ہی نہین بلکہ تمام سنی جماعت دشمن ہو گئی، اس صورت مین اگر بعض مقامات پر خلیفہ کا نام خطبون سے خارج کر دینے مین اس کو کامیابی نہ ہو سکی تو کوئی تعجب کی بات نہین، بغداد پر اس کو تسلط حاصل ہوتا تو ممکن تھا کہ خلیفہ سے خاطر خواہ شرائط قبول کرا لیے جاتے، یہ حاصل نہ ہو سکا تھا تو دوسرا چارۂ کار یہ تھا کہ عباسی خاندان ہی کے کسی فرد کو مسندِ خلافت پر متمکن کر دیتا، ان کے علاوہ منگولی حملے کے خوف نے اسکو اپنے ارادون کو عملی صورت دینے کا موقعہ نہ دیا، بہر حال اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ خوارزم شاہ نے یہ طرزِ عمل اختیار کر کے خلافت پر اس حق کو بالاعلان جتانا چاہا جو سلجوقیون نے اپنے عہد مین در پردہ یہ طرزِ احسن استعمال کیا تھا، اب صورتِ حال اس

حد کو پہنچ گئی تھی کہ خلیفہ اگر سلطان کا نام بغداد کے خطبہ مین شامل نہ کرتا تو سلطان اپنے ممالک مین خلیفہ کا نام خطبہ سے خارج کر کے انتقام لے سکتا تھا، مزید بران خلیفہ مین یہ طاقت نہ تھی کہ سلطان کو اس کے منصب سے معزول کر سکتا، مگر سلطان علماء سے فتویٰ لے کر خلیفہ کے عزل پر قدرت رکھتا تھا،

باایں ہمہ عباسی خلافت جب تک قائم رہی سلاطین کی راہ مین ایک چیز اور حائل تھی اور وہ راے عامہ کی قوت تھی' اب بھی خلافت کا شرعی ادارہ کس قدر مقدس و متبرک سمجھا جاتا تھا اس کا اندازہ ابن اثیر اور اصفہانی جیسے ہمعصر مصنفین کا لب ولہجہ دیکھکر ہو سکتا ہے، مثلاً خاندان عباسیہ کی رفعت و منزلت کا ذکر کرتے ہوے ابن اثیر یہانتک کہتا ہے کہ "جس کسی نے خلیفہ کو نقصان پہنچانا چاہا، اس نے اپنے نامحمود افعال یا ارادون کی سزا ضرور پائی"۔ وہ مصنفین بھی جو سلاطین کے دربارون مین لازم تھے خلافت کے وجود سے چشم پوشی نہ کر سکتے تھے، بلکہ اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے تھے، البتہ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ خلافت ہی کے نظام مین سلاطین کے لئے جگہ پیدا کر لیجائے جو جابجا خلافت کے مقبوضات پر متصرف ہو گئے تھے، نظامی عروضی جو بارہوین صدی مین گذرا ہے، خلافت اور سلطنت کو جدا جدا حیثیت دیتا ہے، اور حالاتِ وقت کے مساعد نظریہ اختراع کر لیتا ہے، وہ کہتا ہے "جب تک کہ ایسا انسان (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) زندہ رہتا ہے وہ فرشتون کی وساطت سے اللہ عز وجل کے احکام پا کر قوم کو ایسی ہدایتین دیتا رہتا ہے جو دنیا اور عقبیٰ کی فلاح کا باعث ہوتی ہین!

مگر جب رحلت کا وقت آجاتا ہے اور وہ دوسری دنیا کو تشریف لے جاتا ہے، تو وہ اپنا قائم مقام ایک قانون چھوڑ جاتا ہے جو الہاماتِ خداوندی اور خود اس کے اقوال پر مبنی ہوتا ہے، قانون اور اتباعِ قانون کو قائم رکھنے کے لئے یقیناً ایک نائب کی ضرورت ہوتی ہے جو قوم کا بہترین فرد اور اس عہد کا اکمل نمونہ ہونا چاہئے تاکہ وہ قانون کو قائم اور نافذ رکھ سکے، یہ نائب امام کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، مگر تنہا امام اقصائے مشرق و مغرب تک نہیں پہنچ سکتا، یہ ممکن نہیں کہ دور و نزدیک اس کا فیضانِ توجہ یکساں شاملِ حال رہ سکے اور عاقل و جاہل سب تک اس کے اوامر نواہی پہنچتے رہیں، لہذا اس کو نائبین کی ضرورت ہے جو دنیا کے بعید مقامات پر اس کے قائم مقام ہو سکیں، لیکن ان میں ہر ایک ایسا صاحبِ قوت نہیں ہو سکتا کہ تمام مخلوق اس کی اطاعت پر مجبور ہو، چنانچہ ضروری ہے کہ ایک صاحبِ جبروت ناظم بھی ہو یہ ناظم سلطان کہلاتا ہے جس کے فرائض میں ایک طرف سیاست داخل ہے تو دوسری طرف امام کی نیابت، چنانچہ سلطان امام کا نائب ہے، امام رسولؐ کا اور رسول خدائے تعالیٰ کا، اس نظریے کے بموجب سلطان کو جائز نہیں کہ خلیفہ کو سیاسی اختیار سے بالخصوص اس حالت میں کہ خلیفہ سلطان کی مثل اپنی مملکت کا نظم ونسق کر سکتا ہو محروم کردے، اگر کوئی سلطان یہ کوشش کرتا تو علما، اور جمہور کی ہمدردی سے ہاتھ دھو لیتا اور دوسرے مسلم حکمران اس سے خلاف ہو جاتے، چنانچہ خوارزمی سلاطین کو اس کوشش میں کہ سلطان کا تفوق قائم کر دیں، کسی طرف سے امداد کی امید

نہ ہو سکتی تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کو غوریہ کے خلاف جن کو خلیفہ سہارا دے رہا تھا قراخطائیہ یعنی کفار کے ساتھ ساز کئے رہنے کی ضرورت تھی، خوارزمی خاندان کے متعلق خلیفہ کی عداوت اور قراخطائیہ کی شرمناک دوستی نے جو جذبات پیدا کر دیئے تھے ان کا اظہار مولانا ظہیر الدین فاریابی نے سلطان تکش کو مخاطب کر کے ان پُرزور طنزیہ الفاظ میں کیا ہے،

شاہا عجم چو گشت مسلّم ز تیغِ تو — لشکر بسوے خوابگہ مصطفٰے فرست
پس کعبہ را خراب کن و ناودان ببر — خاکِ حرم چو ذرہ بسوے ہوا فرست
در کعبہ جامۂ چہ کند در خزانہ نہ — وز بہر روضہ دو سہ صف بوریا فرست
اہلِ ورع بہ آتشِ ظلم و جفا بسوز — واصحابِ کہف را بسوے وادا فرست
تا کافرِ تمام شوی سوے کرخ تاز — وانگہ سرِ خلیفہ بسوے خطا فرست[1]

خوارزمیوں سے لوگوں کو اس درجہ نفرت تھی کہ انھیں قراخطائیہ کی حکومت گوارا تھی، ابن اثیر کا بیان ہے کہ ۵۹۶ھ ۱۱۹۷ء میں جب تکش بخارا کے محاصرے میں مصروف تھا تو اہالیانِ شہر نے قراخطائیہ کا ساتھ دیا اور سخت مقابلہ کیا، سلطان کے ساتھ نفرت کا اظہار اس طرح کیا گیا کہ ایک کانے کتے کو خفتان پہنا کر اور سر پر اونچی سی کلاہ رکھکر دیوار پر بٹھا دیا گیا، اور اس کو تکش کے نام سے منسوب کیا گیا، (تکش یک چشم تھا) اس کے بعد کتے کو سلطان کے لشکر میں یہ کہکر پھینک دیا کہ یہ تو تمہارا سلطان

---

[1] از مخطوطہ کلیات ظہیر فاریابی مملوکہ لٹن لائبریری علی گڈھ، ص ۱۰۰،

یہ ہے۔ ایسی مثالین بھی موجود ہین کہ بعض صوبون کے باشندون نے خلیفہ ناصر سے اپنی طرف سے کسی حاکم کو نامزد کر دینے کی درخواست کی، علاوہ اس کے تکش کی موت کے بعد (۵۹۶ھ ۱۱۹۹ء) ہمدان کے لوگون کا تمام خوارزمی سپاہ کو مار ڈالنا اس نفرت کا کافی ثبوت ہے، جو خوارزمی خاندان کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی،

بغداد کی مہم سے واپس آکر سلطان محمد کی مخالفت حد کو پہنچ گئی، ایک طرف تو صاحبِ سیف طبقہ اس کی مان ترکان خاتون کی سرکردگی مین مخصوص وجوہ کی بنا پر علانیہ سلطان کے خلاف ہوگیا، دوسری طرف علما، کو یہ صدمہ نہ بھولتا تھا کہ خلیفہ کو معزول کرنے کے لئے زبردستی ان سے فتویٰ لکھایا گیا تھا، چنگیز خان سے سلطان کا برسرِ پیکار ہونا بھی جہاد کی حیثیت سے نہ دیکھا جاتا تھا، کیونکہ جو واقعہ اس جنگ کا باعث ہوا تھا وہ یہ تھا کہ سلطان کے ایک صوبہ دار نے ایک قافلے کو تہ تیغ کردیا تھا اور اس قافلے مین تمام مسافر مسلمان تھے، اس بے اصول اور غدارانہ طرزِ عمل کی پاداش صرف تکش ہی کو نہ بھگتنا پڑی، بلکہ اس کا بہادر بیٹا جلال الدین جو یقیناً بہتر انجام کا مستحق تھا اسی کی بدولت مصیبت کا شکار ہوا، جلال کو اس کے باپ کی طرح خلیفہ، مسلم رعایا اور مسلم فرمانروا دشمن کی نظر سے دیکھتے تھے، جس وقت منگولون کے تعاقب سے پریشان ہو کر جلال ۶۱۸ھ ۱۲۲۱ء مین نیشاپور سے زوزان پہنچا اور چاہا کہ وہان قلعہ بند ہو جائے تو اہلِ شہر کے معاندانہ طرزِ عمل نے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا، جس وقت وہ منگولون کے خلاف کمک حاصل کرنے کے لئے خلیفہ کے پاس پہنچا تو صرف یہی نہین کہ مدد نہ ملی بلکہ

خلیفہ کی سپاہ کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کو ملک سے باہر نکال دینے کے لئے روانہ کی گئی تھی؛
بہر حال ناصر کی وفات کے بعد سنہ ۶۲۳ھ ۱۲۲۶ء مین خلیفہ سے اس کی مصالحت ان شرائط پر ہو گئی کہ بعض حکمرانون کو خلیفہ کا باجگذار سمجھا جائے گا اور سلطان اُن سے کسی قسم کی اطاعت اور ماتحتی کا مطالبہ نہ کرے گا، یہ بھی قرار پایا کہ فارس کے جن ممالک مین اسکے باپ نے خلیفہ کا نام خطبے سے خارج کر دیا تھا وہان دوبارہ داخل کر دیا جائے گا، خلیفہ کی طرف سے فارس کے لئے جلال الدین کے نام حکومت کی سند لکھدی گئی، اور کچھ بیش قیمت تحفے اس کے ساتھ روانہ کئے گئے، جلال کو "خاقان" اور "شہنشاہ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا، مگر "سلطان" کا لقب نہ دیا گیا، اس کے بعد مراسلات مین وہ خود کو خلیفہ کا خادم اور خلیفہ کو اپنا آقا اور والی لکھنے لگا، یہ صلح جب ہوئی کہ وقت نکل چکا تھا' اور سلطان کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، چنانچہ جس وقت منگولون کے حملے شروع ہوئے تو دوسرے مسلم حکمرانون نے امداد نہ کی اور خلیفہ مین اتنی قدرت نہ تھی، سنہ ۶۲۷ھ-۶۲۸ھ م ۱۲۳۱ء مین اس نے آخری کوشش کی کہ روم وشام کے مسلم بادشاہون کو مشترک دشمن کے مقابلے کے لئے متحد کر دیا جائے، لیکن مسلم تاجدارون کے حسد اور بے اعتمادی نے یہ اتحاد قائم نہ ہونے دیا، آخر کار سنہ ۶۲۸ھ ۱۲۳۱ء مین منگولون سے بھاگتا ہوا، یہ بہادر سلطان کردستان مین قتل کر دیا گیا، اس طرح خوارزمیون کی حکومت جو سلجوقیون کے اکثر ممالک پر مشتمل تھی ختم ہو گئی۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ خلافت اور سلطنت کی اس جنگ مین خلیفہ کامیاب اور

فاتح رہا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے مین ایرانی حکمرانون پر خلیفہ کا تمام اقتدار ختم ہوگیا، یہ سچ ہے کہ اس وقت خلافت کی قلمرو رقبہ کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ وسیع تھی، لیکن اس واقعہ سے ہمین یہ دھوکا نہ ہونا چاہیئے کہ ان کی کھوئی ہوئی عظمت واپس آگئی تھی، ان مقبوضات پر اُن کا تسلط دنیوی حکمرانون کی حیثیت سے قائم تھا نہ کہ مذہبی قیادت کے سبب، واقعہ یہ ہے کہ خلافت کی شرعی حیثیت اور واقعات کی اصلی صورت دونون ایک دوسرے سے ہمیشہ مختلف رہی تھین، انتخاب کے مسئلے اور مذہبی سیادت نے اس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ قدیم خلافت اب ایک سیاسی حکومت بن گئی تھی جو تلوار کی قوت سے قائم تھی، قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ قوی تر حکومتون نے سیاسی اختیارات جو سابق مین خلیفہ کو حاصل تھے غصب کر لئے، لیکن افسانۂ کہن ابھی تک دہرایا جا رہا تھا، تاکہ ماضی سے رشتۂ ارتباط یک لخت قطع نہ ہو جائے، اور قدامت پرست قلوب وہ صدمہ نہ محسوس کرین جو ہر بدعت کے ساتھ ملزوم ہوتا ہے، چنانچہ واقعی اختیار اور حکومت تو خلیفہ کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، لیکن محض رسمی طور پر اس کے لوازمِ خسروی ابھی تک برقرار تھے، ہر نئے حکمران کو خلیفہ کی طرف سے سندِ حکومت عنایت ہوتی تھی، اس کا نام سکون پر تحریر ہوتا تھا، اور خطبون مین پڑھا جاتا تھا، زمانہ جتنا گذرتا گیا فرمانِ خلافت کی تجدید صرف اس وقت ضروری سمجھی جانے لگی جب کہ حکومت کسی نئے خاندان مین پہنچتی تھی، کچھ عرصے کے بعد اس کی بھی حاجت ختم ہو گئی، اور خلیفہ کی طرف سے خلعتِ سلطانی

عطا ہونا یا کسی اور صورت سے امیر تسلیم کر لیا جانا کافی سمجھا جانے لگا، یہ آخری صورت خوارزم شاہ کے عہد مین ظہور مین آئی،

نظام الملک درباری ہے اور درباری کی حیثیت سے سلطنت کے وجود کو جائز ٹھہراتا ہے، غزالی اس کے برخلاف اُسے ناگزیر سمجھ کر روا رکھتے ہین، اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہین کہ ختم ہونے سے پہلے خلافت ایران کی سیاسی قوت پر اپنا اقتدار کھو چکی تھی، منگولون کے ہاتھ سے جب خلافت کا خاتمہ ہوا تو خلافت صرف ایک سیمیائی وجود تھی، اگرچہ مسلم رعایا کے نازک جذبات کی تسلی کے لئے خطبہ اور سکے مین خلیفہ کا نام ابھی تک داخل تھا جن سیاسی اسباب نے مسلم منگول حکمرانون کو اس امر پر مجبور کر دیا کہ مردہ خلافت کو یہ حق بھی نہ دیا جائے ان کا مطالعہ دلچسپ ضرور ہوگا، لیکن اس کے لئے ایک جدا تالیف کی ضرورت ہے،



تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰	۹	تین لاکھ اسی ہزار	تین کڑور اسی لاکھ
″	″	چار لاکھ اسی ہزار	چار کڑور اسی لاکھ
۴۴	۱۱	مستغنی	مستکفی
″	۱۲	″	″
۴۵	۸	″	″
۶۳	نیچے سے دوسری مین	مغلون	منگولون
۷۸	۱۱	ہامون	مامون
۹۱	۸	خلفار کے بعد لفظ "کی" رہ گیا ہے،	
۱۱۱	۱۱	ماہندی	المحمودی
″	۱۵	ملک شاہ	ملک داؤد،
۱۱۲	″	جانور	کشتیان
″	″	گئے	گئین
۱۱۳	۹	ضروریات پوری ہونی چاہئین،	ضروریات بھی پوری ہوتی ہین،
۱۲۴	۱۲	قلمرو مین اندر	قلمرو کے اندر
۱۲۵	۱۴	ہمدانی	ہمدان،

فہرست مضامین



